"نقش و نگار و رنگ و بو تازہ بہ تازہ نو بہ نو"

نقش و نگار

جوشؔ (ملیح آبادی)

کتب خانہ تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی

مطبوعہ سلطانی بمبئی ۳

۲۰۰۰
تعداد اشاعت دو ہزار

سنہ ۱۹۴۴ء

فہرس

* * * * *

نگارخانہ

شہریست پُر ظریفاں وز ہر طرف نگارے
یاراں صلائے عشق است ار میکنند کارے

(حافظ)

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا بین کا جاگا نیند کا ماتا
نیند کا ماتا، دھوم مچاتا انگڑائیاں لیتا، بل کھاتا

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

رُخ پہ سُرخی، آنکھ میں جادو بھینی بھینی بَر میں خوشبو
بانکی چتون، سمٹے ابرو نیچی نظریں، بکھرے گیسو

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

نیند کی لہریں گنگا جمنی جلد کے نیچے ہلکی ہلکی
آنچل ڈھلکا، مسکی ساری ہلکی مہندی، دھندلی بندی

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

ڈوبا ہُوا رُخ، تابانی میں انوارِ سحر پیشانی میں
یا آبِ گہر طغیانی میں یا چاند کا مکھڑا پانی میں

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

رخسار پہ موجِ رنگینی کچی چاندی، سچی چینی
آنکھوں میں نقوشِ خودبینی مکھڑے پہ سحر کی شیرینی

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

آنکھیں ہیں غلطاں عشرت گاہیں نیند کی سانسیں جیسے آہیں
بکھری زلفیں عُریاں بانہیں جان سے ماریں جس کو چاہیں

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

پھیلا پھیلا آنکھوں میں کاجل اُلجھا اُلجھا زلف کا بادل
نازک گردن پھول سی ہیکل سُرخ پپوٹے نیند سے بوجھل

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

کچھ جاگ رہی کچھ سوتی ہے ہر موجِ صبا مُنہ دھوتی ہے
ناشُستہ رُخ یا موتی ہے انگڑائی سے جسمِ بز ہوتی ہے

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

چہرہ پھیکا نیند کے مارے پھیکے پن میں شہد کے دھارے
جو بھی دیکھے جان کو وارے دھرتی ناتا بوجھ سہارے

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

ہلچل میں دل کی بستی ہے طوفانِ جنوں میں ہستی ہے
آنکھوں میں شب کی مستی ہے اور مستی دل کو ڈستی ہے

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

۱۹۲۵ء

جوانی کی آمد آمد

گیا لڑکپن، نئی جوانی، نئی اداؤں سے آ رہی ہے
جبیں پہ غنچے کھلا کھلا کر، نظر میں دھومیں مچا رہی ہے

شعاعِ اوّل پڑی ہے گویا چمن میں نرگس کی پنکھڑی پر
رسیلی آنکھوں میں ہے تبسّم لبوں پہ سُرخی سی آ رہی ہے

ادائیں پہلو بدل رہی ہیں، نگاہیں کروٹ سی لے رہی ہیں
سنک رہی ہے ہوائے شوخی، حیا کی لَو تھرتھرا رہی ہے

مژہ میں بیدار کر رہا ہے فسوں کو تیر افگنی کا ارماں
دلوں پہ شبخون کی تمنّا، نظر میں جادو جگا رہی ہے

قمر کے خواب آفریں جہاں میں دمکنے والا ہے مہرِ تاباں
جھکا رہا ہے نظر دھندلکا سحر نگاہیں اُٹھا رہی ہے

ہر ایک تارِ نظر برابر مچل رہا ہے پئے نظارہ
ہر ایک موجِ نفس پیاپے درِ طرب کھٹکھٹا رہی ہے

دراز و شب رنگ کاکلوں میں تڑپ رہی ہیں نئی اُمنگیں
صبیح و شاداب عارضوں میں حیاتِ نَو مسکرا رہی ہے

ہوا طبیعت کی رُخ بدل کر بھٹک رہی ہے نئی فضا میں
کلی لڑکپن کی مسکرا کر نئے شگوفے کھلا رہی ہے
جھلکتی چاندی پہ کمسنی کی چڑھا رہا ہے شباب سونا
سفید ہلکی سی چاندنی کو سحر گلابی بنا رہی ہے
گلاب سے عارضوں کی تہ میں شباب تھم تھم کے پرفشاں ہے
نظر فریب انکھڑیوں کی رو میں شراب رس رس کے آ رہی ہے
کمان کی داگرہ پہ چمک رہا ہے خلش کا ناخن
حیات کے دم بخود افق پر نئی کرن جگمگا رہی ہے
جھپک جھپک کر نکیلی پلکیں زباں کے سانچے میں ڈھل رہی ہیں
مچل مچل کر رگوں میں شوخی، قدم اٹھانا سکھا رہی ہے
لچک لچک کر ہر اک قدم پر، کمر میں بل پڑ رہے ہیں پیہم
ٹھنک ٹھنک کر ہوائے عشوہ گھنیری زلفیں ہلا رہی ہے
کلام یوں کر رہی ہے گویا چٹک رہی ہیں چمن میں کلیاں
نگاہ یوں اُٹھ رہی ہے جیسے کوئی پری گنگنا رہی ہے
لبوں پہ وہ سرخیاں ہیں جیسے ہلال دامن میں ہو شفق کے
نظر میں ہے وہ خمار، گویا ذرا ذرا نیند آ رہی ہے

سنہ ۱۹۲۵ء

اُٹھتی جوانی

نئی ہے نامِ خدا جوانی نئی اُمنگیں، نیا زمانہ
جبیں پہ سازِ طرب کی موجیں
نگاہ میں سوزِ شاعرانہ

دلوں پہ مارے ہوئے ہے شبخوں لہو سے ہے سُرخ چشمِ میگوں
ہر اک اشارے میں ایک افسوں
ہر ایک چشمک میں اک فسانہ

نفس میں پھولوں کی سی مہک ہے جبیں پہ خورشید کی دمک ہے
کمر میں تلوار کی لچک ہے
نظر میں بجلی کا آشیانہ

جلو میں مستی و ہوشیاری طواف میں کائنات ساری
جمال کی زد پہ ذوقِ باری
نظر میں شانِ پیمبرانہ

صبیح چہرے پہ نورِ شبنم گداز شانوں پہ زلفِ برہم
ہر ایک موجِ نفس میں پیہم
بلندیوں کی طرف روانہ

ہر اک قدم فتنہ و تلاطم نیاز مندی میں بھی تحکّم

پلک جھپکنے میں اک تبسم
نظر اٹھانے میں اک ترانہ
جو چاہیں صہبائے مشک بو میں   تمام عالم کو غرق کر دیں
یہ سُرخ ڈورے یہ مست آنکھیں
کھلا ہے جن میں شراب خانہ
سدھی ہوئی اس غضب کی پلکیں   کہ آنکھ ملتے ہی دل میں ڈوبیں
مِنچی ہوئی اس بلا کی چُٹکی
کبھی نہ خالی گیا نشانہ
سکوت میں لحنِ دل رُبائی   خطاب میں شانِ کبریائی
جدھر چلی، چل پڑی خدائی
جدھر مڑی، مڑ گیا زمانہ
وہ رُخ پہ طوفانِ کیفِ شب کے   کہ جیسے انگڑائی منہ اندھیرے
ملے جو آنکھیں ہتھیلیوں سے
ٹپک پڑے بادۂ شبانہ
درِ صنم پر خدائے اُلفت   قبول فرما مری عبادت
نہ دے مجھے مسجدوں کی دعوت
کہ دین میرا ہے شاعرانہ

۱۹۲۴ء

یہ نظر کس کے لئے ہے؟

اے نرگسِ جاناں! یہ نظر کس کے لئے ہے؟
یہ شعلہ، یہ بجلی، یہ شرر کس کے لئے ہے؟

اے زہرہ جبینوں کے لئے پیکِ ہزیمت!
پیغامبرِ فتح و ظفر کس کے لئے ہے؟

اے تجھ کو ملے عمر مری شامِ بلا کی!
یہ زلفِ رسا تا بہ کمر کس کے لئے ہے؟

اے سایۂ کاکل میں چمکتے ہوئے عارض!
ظلمات میں یہ آبِ خضر کس کے لئے ہے؟

اے قامتِ بالا و بلند، اے قدِ موزوں!
یہ سرو، یہ شاخِ گلِ تر کس کے لئے ہے؟

اے دیدۂ مے پرور و اے نرگسِ مخمور!
چھلکا ہوا یہ ساغرِ زر کس کے لئے ہے؟

اے عارضِ ناشستہ و روئے عرق آلود!
یہ شہد، یہ شبنم، یہ شکر کس کے لئے ہے؟

اے تجھ پہ فدا چشمکِ خورشیدِ جہاں تاب!
رُخ پر یہ تبسم کا اثر کس کے لئے ہے؟

اے نانوئے کونین کی دیرینہ تمنّا!
قرباں تری زلفوں کے، یہ سر کس کے لئے ہے؟

اے حُسنِ رُخِ روشن و اے جلوۂ کاکل!
یہ ہوش۔ باشام و سحر کس کے لئے ہے؟

اے تیرے قدم پر سرِ خوبانِ سرافراز!
یہ ناز، یہ دُزدیدہ نظر کس کے لئے ہے؟

اے گیسوئے آشفتہ و اے کاکلِ برہم!
یہ عمرِ مسیحا و خضر کس کے لئے ہے؟

اے خود سے اُلجھتی ہوئی بدمست جوانی!
ہر سانس میں یوں زیر و زبر کس کے لئے ہے؟

اے شوخ! کبھی جوش سے اِس نظم کی ضد پر!
یہ پُوچھ کہ تُو خاک بسر کس کے لئے ہے؟

۱۹۲۳ء

افشائے راز

کس طرح مانوں کہ اِس نکھرے ہوئے انداز سے
آ رہی ہیں آپ ابھی خلوت سرائے ناز سے

سعیِ اخفائے حقیقت میں نہ کیجیے اہتمام
عارضِ گلگوں میں رقصاں ہے نسیمِ "باغِ عام"[۱]

چھپ نہیں سکتا ہے اربابِ نظر سے کوئی راز
کیا کوئی خلوت سے آتا ہے بایں طغیانِ ناز؟

حال ابھی کھل جائے گا بکھرا ہے یہ زلفِ دراز
ساتھ ہیں مڑ مڑ کے کتنے دیکھنے والوں کے راز

رہروؤں کی حسرتوں کا ہے نظر میں ارتعاش
جنبشِ مژگاں کی رَو میں کتنے دل ہیں پاش پاش

کتنی تانوں کا اثر ہے رس بھری آواز پر
کتنی سرد آہوں کے پرتو ہیں جبینِ ناز پر

لے رہی ہیں کروٹیں لپٹی ہوئی انوار میں
کتنی للچائی ہوئی نظریں لبِ رخسار میں

کتنے سینوں کی تمنائیں رہینِ اضطرار
اِن گھنی پلکوں کی رنگیں چھاؤں میں ہیں بیقرار

اپنے دامن میں لئے ہے کتنی روحوں کی ترنگ
پنکھڑی کی طرح اِن ترشے ہوئے ہونٹوں کا رنگ

ہیں جلو میں آپ خود دامن جھٹک کر دیکھ لیں
ریشمی آنچل کے چھو لینے کی کتنی حسرتیں

دیکھنے والوں کی بیتابی کا ہے رُخ پر سُرور
چال میں بیدار ہے اُٹھتی جوانی کا غرور

اپنے چہرے کی بہارِ کامرانی دیکھیے
کس قدر بشاش و فرحاں ہے جوانی دیکھیے

کاوشِ اخفا میں اُلٹی اور رسوائی ہوئی
کہیے کیوں اُٹھتی نہیں اب آنکھ شرمائی ہوئی

۱۹۲۶ء

۱؎ حیدرآباد کا ایک دلفریب باغ

یار پری چہرہ

وہ یار پری چہرہ کہ کل شب کو سدھارا
طوفاں تھا، تلاطم تھا، چھلاوا تھا، شرارہ

گل بیز و گہر ریز و گہر بار و گہر تاب
کلیوں نے جسے رنگ دیا، گل نے سنوارا

نوخاستہ و نورس و نوطلعت و نوخیز
وہ نقش جسے خود یدِ قدرت نے ابھارا

خوں ریز و کم آمیز و دل آویز و جنوں خیز
ہنستا ہوا مہتاب، دمکتا ہوا تارا

خوش چشم و خوش اطوار و خوش آواز و خوش اندام
اِک خال پہ قربان سمر قند و بخارا

گل پیرہن و گل بدن و گلرخ و گلرنگ
ایماں شکن، آئینہ جبیں، انجمن آرا

صبح گل نوخاستہ و شام شگوفہ
مر رہنے کا ساماں، تو جینے کا سہارا

آئینۂ رخسار پہ اِک خالِ سیہ تاب
پیشانیِ گل رنگ پہ آنچل کا کنارا

آنکھوں کے جھپکنے میں تقاضائے تلطف
پلکوں کے جھپکنے میں تمنّائے مُدارا

وہ لب کہ مہ نو کی دھڑکنے لگے چھاتی
وہ آنکھ کہ موتی کو نہ ہو صبر کا یارا

کلیوں کی نمائش میں اگر ہو متبسّم
ہو اس کے ہی ہونٹوں کی طرف کثرتِ آرا

نظریں جو اٹھا دے تو لرزنے لگے خورشید
ابرو کو جو بل دے تو ہو مہتاب دو پارا

اللہ ری ملبوس کی تابش شبِ مہ میں
سلما جو دمکتا تھا، جھمکتا تھا ستارا

تھا میری نگاہِ ضرب آموز کا پابند | رنگِ لب و رخسار کا چڑھتا ہوا پارا
صندل کی دمک تھی عرق آلودہ جبیں پر | یا نہرِ گلستاں میں تڑپتا ہوا تارا
نغموں کے تلاطم سے تھا جنبش میں لبِ لعل | لہروں کے تھپیڑوں میں تھا دریا کا کنارا
ہر سانس میں اپنے ہی پہ پیچیدہ جوانی | ہر گام پہ بکھری ہوئی زلفوں کا نظارا
اس طرح تبسّم میں تحکّم کی گھلاوٹ | جس طرح مئے تند کی تلخی ہو گوارا
کاکل کے خم و پیچ سے افشاں کا جھلکنا | ظلمات سے تھا چشمۂ حیواں کا اشارا
سرشار جوانی تھی کہ امڈے ہوئے بادل | شاداب تبسّم تھا کہ جنّت کا نظارا
زلفیں تھیں کہ ساون کی مچلتی ہوئی راتیں | شوخی تھی کہ سیلاب کا مڑتا ہوا دھارا
رُخ بات کا اقرار سے انکار کی جانب | جس طرح ہرن دشت میں بھرتا ہو ترارا

اللہ کرے وہ صنمِ دشمنِ ایماں
مچلے کسی شب جوشؔ کے پہلو میں دوبارا

١٩٣٤ء

نیچی نگاہیں

آہ یہ نیچی نگاہیں، اے نگارِ سرمگیں
عشق، اِس کافرِ حیا کی تاب لا سکتا نہیں!

یہ شہابی رنگ، نازک جلد میں رخسار کی
خون کا یہ رقص، تہ میں عارضِ گلنار کی

سُرخ آنچل کا ڈھلک جانا یہ سر سے بار بار
دونوں ہاتھوں سے چھپا لینا یہ منہ بے اختیار

سرنگوں ہیں پھول، سکتے میں ہے پیمانے کا رنگ
اُف یہ نم آلود رخساروں پہ شرمانے کا رنگ

عارضِ گلرنگ پر یہ پھول سا کھلتا ہوا
یہ تبسم جو طلوعِ صبح سے ملتا ہوا

گفتگو یہ، سر جھکا کر سرمگیں انداز سے
یہ گرہ ہر لفظ میں رکتی ہوئی آواز سے

ہر نفس کڑیاں سی کھانا سانس کی زنجیر میں
کہتے کہتے کچھ یہ رک جانا ترا تقریر میں

لب کو یوں جنبش سی ہونا نُطق شرم آمیز سے
پنکھڑی جس طرح مڑ جائے ہوائے تیز سے

سنہ ۱۹۲۵ء

جمنا کے کِنارے

خورشید طلوع ہو رہا ہے ‏ ‏ ‏ افسانہ شروع ہو رہا ہے
جلووں کی ہے چھوٹ خار و خس پر ‏ ‏ ‏ رقصاں ہے شعاع ہر کلس پر
رہ رہ کے جھلک رہا ہے پیہم ‏ ‏ ‏ ہر ذرّہ خاکدانِ عالم
گردوں کی جبیں دمک رہی ہے ‏ ‏ ‏ پودوں کی کمر لچک رہی ہے
جاگے ہیں طیور چہچہاتے ‏ ‏ ‏ چونکے ہیں حسیں کسمساتے
مکھڑوں پہ لئے بصد تجلّی ‏ ‏ ‏ شبنم کی نمی، صبا کی خنکی
پونچھیں منہ کو اگر ذرا بھی ‏ ‏ ‏ رومال میں چھوٹ آئے سُرخی
رگ رگ میں ہے محوِ پرفشانی ‏ ‏ ‏ وارستہ مزاجِ نوجوانی!
پھوٹی ہے کرن جو تلملاتی ‏ ‏ ‏ شبنم کی دھڑک رہی ہے چھاتی
لائی ہے نسیم بوئے گیسو، ‏ ‏ ‏ کلیوں میں مچل رہی ہے خوشبو

اس عالمِ رنگ و بو کے اندر
میدان سے اِک ذرا سا ہٹ کر

اِک قصر قریبِ رودِ جمنا ‏ ‏ ‏ لہروں کو بنا رہا ہے بینا
یوں قصر کا عکس ہے سرِ آب ‏ ‏ ‏ ارماں جیسے ہوں دل میں بیتاب

اِس قصر کے بام پر کھُلے سر
اِک زہرہ جبین و ماہ پیکر

نوخیز، حسین، بلند بالا — اوڑھے ہوئے سُرمئی دوشالا
افسوں بہ نگاہ و زلف بردوش — غرفے میں کھڑی ہوئی ہے خاموش
فردوس کے در کئے ہوئے باز — ٹیکے ہوئے کہنیاں بصد ناز
رنگین کلائیوں کے جوڑے — چہرے کو ہتھیلیوں پہ رکھے
گلدان میں پھول ہنس رہا ہے — قرآں ہے کہ رحل پر دھرا ہے
طوفان ہیں دل ربائیوں کے — مڑنے میں سُبک کلائیوں کے
آنکھوں میں ہے تابِ صبحِ روشن — ہونٹوں میں شگفتگی کا مسکن
انجم کی طرح جبیں پہ ٹیکا — خورشید سپہرِ کم سنی کا
کانوں میں نظر فریب بُندے — اے کاش کوئی یہ پھول چُن دے
چہرے پہ ہے گرم لن ترانی — اَلّھڑ کا فقرہ نئی جوانی
اِک سانس میں نیند سے گرانبار — اِک سانس میں بیقرار و بیدار
اِک سانس میں پاس آ رہی ہے — اِک سانس میں دور جا رہی ہے
الجھی، بکھری سیاہ زلفیں — چبھتی ہوئی نیند انکھڑیوں میں
دریا کی ہوا جو کھا رہی ہے — بشاش ہے مسکرا رہی ہے

اور یوں کہ قریبِ لب ذرا سا — عارض میں پڑا ہوا ہے حلقہ
اِس حلقۂ دلنشیں کے اندر — غلطیدہ ہیں ناز کے سمندر
یہ شانِ جمال، اللہ اللہ — انسان کے بھیس میں شبِ ماہ
یہ حسن، یہ دل کشی، یہ عالم — سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے شبنم
جس خاک سے گذرے کیمیا ہو — جس بُت پہ نظر کرے، خدا ہو

شاعر کا بھی اک حقیر سجدہ
اے دشمنِ دیں! قبول فرما

"حُسنِ تو ہمیشہ در فزوں باد
رویت ہمہ سال لالہ گوں باد
قدِّ ہمہ دلبرانِ عالم
در خدمتِ قامتت نگوں باد"

سنہ ۱۹۳۸ء — (حافظ)

گنگا کے گھاٹ پر

بڑھائے سُرخیِ عارض ہوائے صحرا سے
نہایا کون چلا آ رہا ہے گنگا سے

سرِ اُولائی کا سر پہ نظر جھکائے ہوئے
دبائے دانتوں میں آنچل بدن چرائے ہوئے

لبوں پہ مُہرِ خموشی خموشیوں میں خطاب
کمر میں لوچ جبیں پر دمک نظر میں شراب

قدم قدم پہ تمنّائیں دلستانی کی
رُخِ شگفتہ پہ طغیانیاں جوانی کی

شرابِ ناب لئے نرگسی کٹوروں میں
لہو چمن کا رواں سُرخ سُرخ ڈوروں میں

دراز زلف میں جادو سیاہ آنکھ میں مدھ
نسیمِ صبحِ بنارس ہلالِ شامِ اودھ

ہوائے صبح سے روشن چراغِ سیم تنی
شگفتہ غسلِ سحر سے مزاجِ گل بدنی

نظر نہ آئے وہ چہرے پہ چادرِ آبی
بیاضِ چشم میں گل کاریٔ شکر خوابی

خنک نسیم سے اُبھرے ہوئے نقوشِ شباب
صباحتیں ہیں کہ برسات کی شبِ مہتاب

عجیب حُسن ٹپکتا ہے چشم و ابرو سے
مہک رہی ہے ہوا کمسنی کی خوشبو سے

مقابلہ جو کرے کوئی، چاند پھیکا ہے
جبینِ شوخ پہ صندل کا سرخ ٹیکا ہے

نمی ہے زلف میں، اشنان کر کے نکلی ہے
یہ کس کی موت کا سامان کر کے نکلی ہے؟

لبوں پہ کھیل رہا ہے اثر نہانے کا
گمان ہوتا ہے ہر بار مسکرانے کا

سیاہ زُلف پہ آنچل خفیف آبی ہے
برہنہ پا ہے تو ہر نقشِ پا گلابی ہے

مری طرف سے کوئی کاش یوں ہو گرمِ خطاب
کہ وقتِ صبح ہے اے دخترِ شبِ مہتاب

ازل کے دن سے درِ حُسن کا بھکاری ہوں
اِدھر بھی ایک نظر، میں ترا پجاری ہوں

سنہ ۱۹۲۲ء

مالن

آ رہی ہے باغ سے مالن وہ اٹھلاتی ہوئی
مسکرانے میں لبوں سے پھول برساتی ہوئی

بار بار آنکھیں اٹھاتی، سانس لیتی تیز تیز
رس جوانی کا گھنی پلکوں سے ٹپکاتی ہوئی

پاؤں رکھتی ناز سے شبنم کے قطروں کی طرح
سبزۂ خوابیدۂ گلشن کو چونکاتی ہوئی

آستینوں میں سے جھلکاتی ہوئی باہوں کا رنگ
کاکلوں میں سے "کرن پھولوں" کو جھمکاتی ہوئی

نغمۂ گیسو سے ہر جھونکے میں بھرتی بوئے گل
نقشِ پا سے ہر روش میں خون دوڑاتی ہوئی

نصف آنکھیں بند کر کے سونگھتی پھولوں کے ہار
ہر نفس بیہوش ہو کر ہوش میں آتی ہوئی

چھیڑ خود اپنے ہی سے کرتی ہوئی مستانہ وار
ہر قدم پر کاکلوں کی طرح بل کھاتی ہوئی

اینڈتی، مڑتی، خود اپنی کمسنی سے کھیلتی
بھاگتی، رکتی، ٹھٹکتی، بال بکھراتی ہوئی

گنگناتی، مسکراتی، لڑکھڑاتی، جھومتی
مثلِ ابر اپنے ہی پر خود پیچ و خم کھاتی ہوئی

پھول ہیں آنچل میں، آنچل لوٹتا ہے دوش پر
اور آنچل پر گھنی زلفیں ہیں لہراتی ہوئی

ہائے کیا گوری کلائی میں ہے لچھا دلفریب
ہائے کیا چاندی کی ہیکل ہے ستم ڈھاتی ہوئی

جوش پوچھے کوئی اس گل پیرہن مالن کا نام
آ رہی ہے غنچۂ دل کو جو چٹکاتی ہوئی

۱۹۲۳ء

جامن والیاں

رُوحِ شاعر آج پھر ہے وجد میں آئی ہوئی
آم کے باغوں پہ ہے کالی گھٹا چھائی ہوئی

مست بھونرا گونجتا پھرتا ہے کوہ و دشت میں
رم بھرتی ہے کسی وحشی کی گھبرائی ہوئی

غنچہ غنچہ اپنے فطری رنگ میں ڈوبا ہُوا
پتّی پتّی اپنے اصلی رنگ پر آئی ہوئی

خارِ صحرا نسیمِ ابر و باد سے نکھرے ہوئے
خاکِ گلشن، موجِ رنگ و بو سے اترائی ہوئی

بہ رہی ہیں ندیاں ساون کے نغموں کی طرح
گا رہی ہیں کوئلیں، موسم کی تڑپائی ہوئی

آ رہی ہیں ناز سے نوخیز جامن والیاں
انکھڑیوں میں اجنبیت، چال اٹھلائی ہوئی

عمر کے نشے سے کچھ کچھ نیند میں ڈوبی ہوئی
برق کی ہلچل سے کچھ کچھ ہوش میں آئی ہوئی

ابر میں لچکے ہوئے پودوں کا دست و پا میں لوچ
دھوپ کے تپتے ہوئے کھیتوں کی سنولائی ہوئی

پھر رہی ہیں تربتر گلیوں میں سوتی جاگتی
منہ اندھیرے ہی سے بوچھار کی چونکائی ہوئی

دونوں ہاتھوں سے سنبھالے ہیں سروں کی ٹوکری
ہاتھ انگڑائی کی صورت، آنکھ شرمائی ہوئی

ہائے یہ بکھری ہوئی زلفیں، یہ کالی جامنیں
ہائے یہ گلشن، یہ ساون کی گھٹا چھائی ہوئی

پائے نازک راہ کے پانی سے یہ بھیگے ہوئے
پنڈلیاں، زورِ جوانی سے یہ بل کھائی ہوئی

ہائے یہ پھبتی ہوئی نوعمر جامن والیاں
عاقبت اندیش دہقانوں کی سمجھائی ہوئی

یہ جھجک اُٹھنا جوانوں کی نظر سے بار بار
یہ نگاہیں شہر کی گلیوں میں گھبرائی ہوئی

ہائے یہ کافر مناظر ہوش میں رکھتے نہیں
جوشش اِن فصلوں میں اکثر اپنی رسوائی ہوئی

سنہ ۱۹۲۵ء

مشغلے کا اثر

"دیکھتا تھا روز اِک عورت کو میں وقتِ سحر
بوریے بُنتے ہوئے پتلی گلی کے موڑ پر

سر سے پا تک بستۂ محویتِ اندوہناک
خال و خد پر ظلمتِ سنجیدگی و انہماک

شوق اس عورت میں روحِ ناز پاتا ہی نہ تھا
دل لبھانے کا کوئی انداز پاتا ہی نہ تھا

لیکن اک دن صبح کو چھائی ہوئی تھی جب گھٹا
موڑ پر میں دفعتہً حیران ہو کر رہ گیا

دیکھتا کیا ہوں وہی "عورت" بصد اندازِ ناز
چمپئی ماتھے پہ بکھرائے ہوئے زلفِ دراز

عشوۂ ترکانہ کے ساتھ ایک ظرفِ تنگ میں
دے رہی تھی ڈوب ساری کو گلابی رنگ میں،

دل پکارا آج کیسی آگ سی بھڑکی ہے یہ
مجھ پر اُس دن یہ کھلا "عورت" نہیں "لڑکی" ہے یہ

سنہ ۱۹۳۲ء

جنگل کی شاہزادی

پیوست ہے جو دل میں وہ تیر کھینچتا ہوں — اک ریل کے سفر کی تصویر کھینچتا ہوں

گاڑی میں گنگناتا مسرور جا رہا تھا — اجمیر کی طرف سے جے پور جا رہا تھا

تیزی سے جنگلوں میں یوں ریل جا رہی تھی — بیلی ستار اپنا گویا بجا رہی تھی

خورشید چھپ رہا تھا رنگیں پہاڑیوں میں — طاؤس پر سمیٹے بیٹھے تھے جھاڑیوں میں

کچھ دور پر تھا پانی، موجیں رکی ہوئی تھیں — تالاب کے کنارے شاخیں جھکی ہوئی تھیں

لہروں میں کوئی جیسے دل کو ڈبو رہا تھا — میں سو رہا ہوں، ایسا محسوس ہو رہا تھا

اک موج کیف پرور دل سے گزر رہی تھی — ہر چیز دلبری سے یوں رقص کر رہی تھی

تھیں رخصتی کرن سے سب وادیاں سنہری — ناگاہ چلتے چلتے جنگل میں ریل ٹھہری

کانٹوں پہ خوبصورت اک بانسری پڑی ہے — دیکھا کہ ایک لڑکی میدان میں کھڑی ہے

زاہد فریب، گل رخ، کافر دراز مژگاں — سیمیں بدن، پری رخ، نوخیز، حشر ساماں

خوش چشم، خوبصورت، خوش وضع، ماہ پیکر — نازک بدن، شکر لب، شیریں ادا، فسوں گر

کافر ادا، شگفتہ، گل پیرہن، سمن بو — سرو چمن، سہی قد، رنگیں جمال، خوش رو

گیسو کمند، مہوش، کافر، تمام قاتل — نظارہ سوز، دلکش، سرمست، شمع محفل

ابرو ہلال، مے گوں، جاں بخش، روح پرور — نسریں بدن، پری رخ، سیمیں عذار، دلبر

آہو نگاہ، نورسن، گلگوں، بہشت سیما — یاقوت لب، صدف گوں، شیریں، بلند بالا

غارت گرِ تحمل، دل سوز، دشمنِ جاں — پروردۂ مناظر، دوشیزۂ بیاباں

گلشن فروغ، کمسن، مخمور، ماہ پارا — "دلبر کہ در کفِ او موم است سنگِ خارا"

ہر بات ایک افسوں، ہر سانس ایک جادو — قدسی فریب مژگاں، یزداں شکار گیسو

صحرا کی زیب و زینت، فطرت کی نور دیدہ — برسات کے ملائم تاروں کی آفریدہ

چہرے پہ رنگِ تمکیں، آنکھوں میں بےقراری — ابھائے سینہ کو بھی فرمانِ بادہ خواری

لوہا تپانے والی جلووں کی ضو فشانی — سکتے بٹھانے والی اٹھتی ہوئی جوانی

ڈوبے ہوئے سب اعضا حسنِ مناسبت میں — پالی ہوئی گلوں کے آغوشِ تربیت میں

حسنِ ازل ہے غلطاں شاداب پنکھڑی میں — با جان پڑ گئی ہے جنگل کی تازگی میں

حوریں ہزار دل سے قرباں ہو گئی ہیں — رنگینیاں سمٹ کر "انساں" ہو گئی ہیں

چینِ ستمگری سے ناآشنا جبیں ہے — میں کون ہوں؟ یہ اس کو معلوم ہی نہیں ہے

ہر چیز پر نگاہیں حیرت سے ڈالتی ہے — رہ رہ کے اڑنے والی چادر سنبھالتی ہے

آنچل سنبھالنے میں یوں بل سے کھا رہی ہے — گویا ٹھہر ٹھہر کر انگڑائی آ رہی ہے

کچھ دیر تک تو میں نے اس کو بغور دیکھا — غش کھا رہی تھی عقبیٰ، چکرا رہی تھی دنیا

گاڑی سے پھر اتر کر اس کے قریب آیا — طوفانِ بیخودی میں پھر یہ زباں سے نکلا

اے درسِ آدمیت! اے شاعری کی جنت — اے صانعِ ازل کی نازک ترین صنعت

اے رُوحِ صنفِ نازک اے شمعِ بزمِ عالم
اے صبحِ روئے خنداں اے شامِ زُلفِ برہم

اے تو کہ تیری نازک ہستی میں کام آئی
قدرت کی انتہائی تخئیلِ دل رُبائی

چشم و چراغِ صحرا اے نورِ دشت زادی
رنگیں جمال دیوی جنگل کی شاہزادی

بستی میں تو جو آئے، اک حشر سا بپا ہو
آبادیوں میں ہلچل شہروں میں غلغلہ ہو

رندانِ بادہ کش کے ہاتھوں سے جام چھوٹیں
تسبیحِ شیخ اُلجھے، توبہ کے عزم ٹوٹیں

نظروں سے اتقا کے رسم و رواج اتریں
زُہاد کے عمامے، شاہوں کے تاج اُتریں

آنکھیں ہوں اشک افشاں، نالے شرر فشاں ہوں
کیا کیا نہ شاعروں کے ملبوس دھجیاں ہوں

شہروں کے مہوشوں پر اک آسمان ٹوٹے
پروردۂ تمدّن عشووں کی نبض چھوٹے

اِس سادگی کے آگے نکلیں دلوں سے آہیں
جھک جائیں دلبروں کی خود ساختہ نگاہیں

تیری ادا کے آگے شرما کے منہ چھپائیں
ناپے ہوئے کرشمے، تولی ہوئی ادائیں

تیری نظر کی زد سے ہو جائیں خستہ و گم
مشق و مزاولت کے پالے ہوئے تبسّم

اِس داماں کے رُخ کو بے آب و رنگ کر دے
دنیا کو حُسن تیرا میدانِ جنگ کر دے

کتنی ہی قسمتوں کے بدلے فلک نوشتے
خون اور دوستی کے کٹ جائیں کتنے رشتے

تصنیف ہوں ہزاروں چبھتے ہوئے فسانے
اِن انکھڑیوں کی زد پر کانپیں شراب خانے

تیرے پجاریوں میں میرا بھی نام ہوتا
اے کاش جنگلوں میں میرا قیام ہوتا

یہ بَن، یہ گُل، یہ چشمے، مجھ سے قریب ہوتے
شاعر کے زیرِ فرماں یہ سب رقیب ہوتے

کیوں میری گفتگو سے حیرت فروش کیوں ہے؟ — اے زمزمیوں کی دیوی اتنی خموش کیوں ہے؟
بجنے لگیں وفا کی محفل میں شادیانے — ہاں تیرے لبوں کو جنبش اے سرمدی ترانے
یوں چپ ہے مجھ سے گویا کچھ کام ہی نہیں ہے — یہ وہ ادا ہے جس کا کچھ نام ہی نہیں ہے

سنتا تھا یہ کہ ظالم اس طرح مسکرائی
فریاد کی نظر نے، ارماں نے دی دہائی

عشوہ جبیں پہ بنکر دل کی امنگ آیا — چہرے پہ خون دوڑا، آنکھوں میں رنگ آیا
شرما کے آنکھ اٹھائی، زلفوں پہ ہاتھ پھیرا — اتنے میں رفتہ رفتہ چھانے لگا اندھیرا
چمکا دیا حیا نے ہر نقش دلبری کو — دانتوں میں یوں دبایا چاندی کی آرسی کو
سن کر مری مچلتی آنکھوں کی داستانیں — اس کی نگاہ میں بھی غلطاں ہوئیں زبانیں
شرما گے پھر دوبارہ زلفوں پہ ہات پھیرا — دیکھا تو چھا چکا تھا میدان پر اندھیرا
کچھ جسم کو چرایا کچھ سانس کو سنبھالا — کاندھے پہ نرم آنچل انگڑائی لیکے ڈالا
تاریک کر گئے میری آنکھوں میں اک زمانہ — جنگل سے سر جھکا کر ہونے لگی روانہ
ہونے لگی روانہ، ارماں نے سر جھکایا — دل کی مثال کانپا رہ رہ کے بن کا سایا
بیہوش ہو چلا میں، سینے سے آہ نکلی — اتنے میں رات لے کر قندیل ماہ نکلی

مڑ کر جو میں نے دیکھا، امید مرچکی تھی
پٹڑی چمک رہی تھی، گاڑی گزر چکی تھی

سنہ ۱۹۲۲

اشکِ اوّلین

خوشا وہ دن کہ شادابی تھی دل میں جب لڑکپن کی
بہاریں لوٹتی تھی جب وہ میرے ساتھ گلشن کی

کلی روحوں کی کھلتی تھی خنک جاڑوں کی راتوں میں
انگیٹھی کے کنارے نیند اڑ جاتی تھی باتوں میں

ہوائے سرد کے جھونکے ہمیں بے خود بناتے تھے
فرشتوں کی طرح شفّاف چشموں میں نہاتے تھے

جب اوجِ چرخ پر ساون کے بادل گھر کے آتے تھے
ہوائے نرم میں کیا کیا نہ ہم دھومیں مچاتے تھے

میں پہروں نیم کے نیچے اسے جھولا جھلاتا تھا
وہ گاتی تھی، مگر اس کو نہ کچھ آتا، نہ جاتا تھا

خفا ہوتے تھے تو اک دوسرے کا منہ چڑھاتے تھے
گھروندے صحن میں بن بن کے اکثر ٹوٹ جاتے تھے

نہ دن کو دل دھڑکتا تھا، نہ شب کو آنکھ روتی تھی
محبت اتنی نازک تھی کہ مطلق حس نہ ہوتی تھی

کسے معلوم تھا، اک روز ہوگی سرگرانی بھی
دبے پاؤں چلی آتی ہے تیزی سے جوانی بھی

زمیں پھرتی رہی، ذرّات میں ہوتی رہی گردش
اسی کے ساتھ محسوسات میں ہوتی رہی گردش

بھرے ظالم کے شانے کشتیِ طفلی کے کھینے سے
کلی کھلتی رہی جلووں کی پیہم سانس لینے سے

جوانی سینۂ طفلی میں اٹھلاتی رہی برسوں
کوئی مبہم تمنا دل کو گرماتی رہی برسوں

مچلتا سا رہا ذوقِ تماشا آنکھ کے تل میں
تڑپ بھرتی رہی اک غیر محسوس آرزو دل میں

زمینِ برف میں تخمِ شرر بوتی رہی بجلی
تنِ نازک میں رفتہ رفتہ حل ہوتی رہی بجلی

جلا ہوتی رہی پردے ہی میں زلفِ پریشاں پر
زمرد کے ورق چڑھتے رہے رخسارِ تاباں پر
لب و رخسار کو دیتی رہی درسِ درخشانی
دلِ نازک کے نامعلوم ارمانوں کی جولانی

(۲)

نہ دیکھی تھی ابھی دنیا، سمجھ لیتا میں یہ کیونکر
کہ کچھ دن میں سفر سے کوئی پلٹے گا جواں ہو کر

نظر اب جو اٹھائی تو یکایک دیکھتا کیا ہوں
کہ میں تنہا ہزاروں بجلیوں کی زد پہ بیٹھا ہوں
دفورِ ناز سے چھٹنے پہ ہیں نبضیں محبت کی
شناسائی کے ماتھے پر ہیں لہریں اجنبیت کی
نظر میں مضمحل ہیں چشمکیں اگلے زمانے کی!
لبِ نازک پہ ہے سکتے میں عادت مسکرانے کی
خلافِ رسم یہ عالم جو میرے روبرو آیا
معاً آنکھوں میں اشکِ اولینِ آرزو آیا
پہیلے تو آئی اک چمک آنسو کے محمل میں
یکایک کھل گیا پھر اک دریچہ سا مرے دل میں
حریمِ جاں کی میں نے اس دریچے سے زیارت کی
نظر آئی مجھے خونیں کفن دیوی محبت کی
بقا کے پھول کو تابوت پر کھلتے ہوئے دیکھا
اجل کو زندگانی سے گلے ملتے ہوئے دیکھا
صدائیں گونج اٹھیں دل میں ہزاروں آبشاروں کی
ہوا چلنے لگی سینے میں لافانی بہاروں کی
معاً اک آگ سی سوزِ دروں نے دل میں بھڑکائی
تمنا کسمسائی غم نے لی سینے میں انگڑائی
مرے پہلو میں پہلی مرتبہ اک پھانس سی کھٹکی
گھٹا سی چھا گئی دل پر کلی سی روح میں چٹکی
نرالا خوف انوکھی کشمکش نا آشنا ہلچل
گرجتے ہوں کہیں کچھ دور جیسے خواب میں بادل

دکھائی اک نئی دنیا نے کچھ یوں بزم آرائی — یکایک آئے چشمِ کور میں جس طرح بینائی
جہاں کا ذرّہ ذرّہ دیدۂ حیراں نظر آیا — میں خود اپنے کو اک بدلا ہوا انساں نظر آیا
وہ بھڑکی آگ سینے میں رگ و پے کو تپا ڈالا — زباں سے یہ مری بیساختہ نکلا "جلا ڈالا"
یہ سنتے ہی جبینِ حسن پر پہلی شکن آئی — جلو میں سیکڑوں جلوے لئے گویا دلہن آئی
غرورِ حسن نے بگڑے ہوئے انداز سے دیکھا — نیازِ عشق صدقے ہو گیا، اس ناز سے دیکھا
کہا کچھ زیرِ لب زلفیں ہٹا کر روئے تاباں سے — مہک دوشیزگی کی آئی لعلِ عطر افشاں سے
جوانی گومگو میں پڑ کے غش کھانے لگی گویا — جماہی کی طرح لی سانس نیند آنے لگی گویا
نظر میں آ گیا رنگِ تمنّا کھنچ کے سینے سے — گلابی ہو گیا کچھ اور بھی چہرہ پسینے سے
بچا کر آنکھ پرکھا اس نے میرے دل کی حالت کو — ادا سے پھیر کر آنکھوں پر انگشتِ شہادت کو
اٹھائیں انکھڑیاں رخ سے ہٹا کر کاکلِ مشکیں — نظر میں یادِ ایامِ طرب نے کروٹیں بدلیں
یکایک کھنچ گیا دل میں تخیل کج ادائی کا — لبوں پر آ چلا کچھ کچھ تبسّم دلربائی کا
خفیف اک رنگِ الفت حسن کے پندار میں جھلکا — تصوّر صحبتِ دیرینہ کا رخسار میں جھلکا
ستم ہی ڈھا دیا بھولے سے عریاں ہو کے بانہوں نے — بقدرِ یک نظر تقدیر کی نیچی نگاہوں نے
گلے پر ہمدمِ طفلی کے تیغِ خوں فشاں پھیری — ذرا سا مسکرا کر سرخ ہونٹوں پر زباں پھیری

مٹا ڈالا ہے جس ظالم نے میری شادمانی کو
الٰہی خیر کی توفیق دے اس کی جوانی کو

۱۹۲۳ء

کوہستانِ دکن کی عورت

یہ اُبلتی عورتیں، اِس چلچلاتی دھوپ میں
سنگِ اسود کی چٹانیں آدمی کے رُوپ میں

واہ کیا کہنا ترا، اے حُسنِ ارضِ آفتاب
یہ برشتہ رنگ، یہ تپتے ہوئے سنگیں شباب

ہر سراپا، بُت تراشوں کی عرق ریزی کا پھل
اتنی بے پایاں صلابت پر بھی ہر نقشہ سجل

چال جیسے تند چشمے، تیوریاں، جیسے غزال
عارضوں میں جامنوں کا رنگ، آنکھیں ہمتیال

عورتیں ہیں یا کہ ہیں برسات کی راتوں کے خواب
پھٹ پڑا ہے جن پہ طوفاں خیز تھرّایا شباب

یہ جواں چہرے، یہ چہروں میں برنائی کا جوش
تو کے آہن میں کھوڑے ہیں کسی نے چشم و گوش

جسم میں کچھ اِس قدر ٹھوس، الحفیظ والاماں!
لیجیے چٹکی، تو چھل جائیں خود اپنی انگلیاں

مچھلیاں شانوں کی اُبھری سی، بٹی سی کاکلیں
آہن و فولاد کے پٹھے، سلاخوں کی رگیں

دید کے قابل ہے اِن کافر بتوں کا رنگ رُوپ
کھپ چکی ہے جسمیں بارش، ڈس چکی ہے جسکو دھوپ

اِن بناتِ کوہ کی کرڈیل جوانی الاماں!
پتھروں کا دُودھ پی پی کر ہوئی ہیں جو جواں

کنکروں کے فرش پر دُنیا سلاتی ہے جنہیں
آندھیوں کے پالنے میں نیند آتی ہے جنہیں

کیا خبر کتنے دلوں کی جوشش پامالی ہوئی
اِن اداؤں سے کہ طوفانوں میں پامالی ہوئی

١٩٣٤ء

حُسنِ بیمار

کیا غضب ہے حُسن کے بیمار ہونے کی صدا
جیسے کچی نیند سے بیدار ہونے کی ادا

انکسارِ حُسن، پلکوں کے جھپکنے میں نہاں
نیم وا بیمار آنکھوں سے مروت سی عیاں

جنبشِ مژگاں میں غلطاں سازِ غم کا زیر و بم
خامشی میں پر فشاں الفائے پیماں کی قسم

احترامِ عشق کی رَو، دلنشیں آواز میں
ایک پھیکے پن کا سناٹا دیارِ ناز میں

الاماں آنکھوں کی نیم افسردہ سی افسوں گری
ایک دھندلا سا تبسم، اک تھکی سی دلبری

چوڑیاں ڈھیلی، دلائی پُر شکن، ماتھے پہ ہات
لب پہ خشکی، رخ پہ سوندھا پن، نظر میں التفات

ہلکی ہلکی جھلکیاں رُخسار پر یوں نُور کی
جیسے گُل پر صبحِ کاذب کی سہانی چاندنی

لے رہا ہے کروٹیں عارض میں یوں رنگِ شباب
جس طرح موجِ خراماں پر ضیائے ماہتاب

حُسن یوں کھویا ہوا سا بزمِ محسوسات میں
جیسے دونوں وقت ملتے ہوں بھری برسات میں

یوں ہے اک روشن نمی سی چشمِ سحر انداز میں
صبح کو شبنم ہو جیسے عرضِ پرواز میں

جیسے کہرے میں کوئی تابندہ منظر دور کا
جیسے پچھلی رات کے سینے پہ ڈورا نور کا

ایسے اضمحلال پہ دنیا کی برنائی نثار
ایسی بیماری پہ اعجازِ مسیحائی نثار

۱۹۲۹ء

جوانی کا تقاضا

منہ اندھیرے تھی جب آویزش سی مہر و ماہ میں
مہترانی اِک نظر آئی مجھے کل راہ میں

چھاؤں میں تاروں کی کچّی نیند سے چونکی ہوئی
اِک قدم پر جاگتی، اِک گام پر سوتی ہوئی

رنگ سا اِک شہر پیما پائے بے پاپوش پر
رُخ پہ نیندیں، ہل گئی ساری کا پلّو دوش پہ

چال اٹھلائی ہوئی، گردن کا خم مستانہ وار
انکھڑیوں میں تنگ کوچوں میں تصوّر کا غبار

لیکن اس عالم میں بھی اے محوِ فطرت ہمنشیں!
غم کا کوئی خار پیشانی کے پھولوں میں نہیں

دیدنی ہے تلخ پیشے کا یہ اندازِ طرب
اِک چمک سی انکھڑیوں میں ایک لے سی زیرِ لب

سچ ہے طوفانِ جوانی کو دبا سکتا ہے کون؟
سرِ شبابِ شعلہ پرور کا جھکا سکتا ہے کون؟

مہترانی ہو کہ رانی، گنگنائے گی ضرور
کچھ بھی ہو جائے، جوانی گنگنائے گی ضرور

سنہ ۱۹۲۳ء

شاعر کی نماز

اِک زنِ کم رُو سحر کو آئینے کے سامنے
ہات میں کنگھی لئے، کھڑکی کا پٹ کھولے ہوئے

دیر سے سُلجھا رہی تھی کاکُلِ پُرپیچ و خم
لے رہا تھا آنکھ میں لہریں مگر سفاک غم

آئینے سے کہہ رہی تھی چشمِ حسرت آفریں
اِس کرُے پر کوئی میرا پوچھنے والا نہیں

کس قدر قحطِ خریداری نے ہلکا کر دیا
تجھکو اے میری جوانی کی متاعِ بے بہا!

یہ مرے گیسو، یہ لب، یہ چشم، یہ رُخ، یہ دہن
آہ یہ برنائیاں، اور اِس قدر رنج و محن-

اِس زمیں پر جستجوئے جلوۂ رنگیں نہیں
پھول تو موجود ہے لیکن کوئی گلچیں نہیں

اِس سماں سے قلبِ شاعر ہو گیا زیر و زبر
اور کچھ اِس پیار سے ڈالی بناوٹ کی نظر

عارضِ شب رنگ پر سُرخی نمایاں ہو گئی
ہات قبضے پر گیا، تلوار عریاں ہو گئی

آنکھ کے پردوں میں گویا شہد سا گھُلنے لگا
سانس کچھ اِس ناز سے لی، رنگ رُخ کھلنے لگا

خشک ہونٹوں پر تبسم رنگ برسانے لگا
خال و خد کی گُتھیاں پندار سلجھانے لگا

عشوہ، سُرخی سی سیہ چہرے پہ دوڑانے لگا
ظلمتوں میں آبِ حیواں ناز فرمانے لگا

اِک ذرا گھرا سا ہو کر ہر نفس آنے لگا　　ناز سے انگڑائی لی آنکھوں میں رس آنے لگا
صبح کی تنویر شبنم سے گلے ملنے لگی　　مَس کیا بادِ سحر نے، اور کلی کھلنے لگی
ہات میں 'صیّاد' کاندھے سے کماں لینے لگا　　چشم و ابرو میں غرور انگڑائیاں لینے لگا
خود بخود آرائشِ کاکل سے شرمانے لگی　　دست و پا میں ایک ہلکی لہر سی آنے لگی

دیکھ اے زاہد! اسے کہتے ہیں شانِ سوز و ساز
شاعرانِ پاک دل اِس طرح پڑھتے ہیں نماز

سنہ ۱۹۳۰ء

خمریات

خیز و در کاسۂ زر آبِ طربناک انداز

پیش ازانے کہ شود کاسۂ سر خاک انداز

(حافظ)

یومِ بہار

اے ہمنشیں! وہ جوشِ مئے ارغواں ہے آج
صہبا کی ایک بوند میں کون و مکاں ہے آج

ہر غنچہ کہ رقص کناں ہے بطرحِ نو
چشم و چراغِ سلسلۂ قدسیاں ہے آج

جس پر نثار موجۂ تسنیم و سلسبیل
بکھری ہوئی وہ کاکُلِ عنبر فشاں ہے آج

اللہ رے سیلِ نغمہ و طوفانِ رنگ و بُو
موجِ ہوا میں جنبشِ نبضِ جواں ہے آج

شکرِ خدا کہ طرّۂ طرفِ کلاہِ دوست
مشعل فروزِ مجلسِ روحانیاں ہے آج

پھر چہرۂ بشر پہ ہے رنگِ اُلوہیّت
پھر فرشِ خاک پر سرِ کرّوبیاں ہے آج

اوجِ فلک پہ موجۂ ابرِ سبک خرام
صحنِ چمن میں جلوۂ سروِ رواں ہے آج

وہ دُخترِ رز کہ تھی خمِ رنگیں میں معتکف
صد شکر صدرِ انجمنِ مے کشاں ہے آج

اُف ری شمیمِ کاکُلِ شب رنگ و بوئے عود
دوشِ صبا پہ دولتِ باغِ جناں ہے آج

رندوں کے ساتھ روحِ دو عالم ہے رقص میں
یومِ طوافِ کعبۂ رطلِ گراں ہے آج

ہر آرزو کے مفرق پہ کج ہے کلاہِ ناز
"عین الیقیں" بہشت کا وہم و گماں ہے آج

زیرِ نگیں زمیں ہے، قبضے میں آسماں
آفاق پر حکومتِ پیرِ مغاں ہے آج

ہر خشک و تر میں گونج رہی ہیں حکائتیں
ہر ذرۂ حقیر کے منہ میں زباں ہے آج

روح کو اڑا رہا ہے مسیح و خضر کا رنگ
کیا جانے کس لباس میں عمرِ رواں ہے آج

اے جوشؔ زلزلے میں ہے فقرِ تعینات
دل ماورائے قیدِ زمان و مکاں ہے آج

۱۹۲۶ء

چند جرعے

جرعۂ اوّل

تعالی اللہ شانِ بادہ خواری
نئی ہلچل، نرالی بیقراری

کوئی کروٹ سی دل میں لے رہا ہے
لہو میں کشتیاں سی کھے رہا ہے

یہ کیسی سن رہی ہے روح آہٹ
رگوں میں ہے مزے کی سنسناہٹ

چمکتی ہیں فضا میں بجلیاں سی
لچکتی ہے رگ و پے میں کماں سی

زہے رفتارِ خونِ زندگانی
بغیر اسباب شادی، شادمانی

نئی شکلیں ہیں سینے پہ منقش
مبارک امتزاجِ آب و آتش

پیئے بیٹھا ہوں آج اے زاہدِ خام
شرابِ رندخوار و ساغرِ آشام

اِدھر ہنگامۂ صہبا پرستی
اُدھر آویزشِ تمکین و مستی

سخن کی داد خود سے پا رہا ہوں
کلی کی طرح کھلتا جا رہا ہوں

اٹھا ساغر کہ پھر آواز آئی
کہ بد مستی بہ از زاہد ریائی

جرعۂ دوم

رگ و پے میں ہے، غلطاں نوجوانی ہر اک لمحہ ہے عمرِ جاودانی
مری مٹھی میں ہے روحِ مہ و سال نہاں ہے ماضی و مستقبل و حال
ترانے وقت سے آزاد ہو کر ہوئے ہیں ساز کے پردوں سے باہر
گھٹا سی اک سنہری آ رہی ہے پھریری پر پھریری آ رہی ہے
گراں زنجیرِ دانش، کٹ رہی ہے متانت کی جوانی ڈھل رہی ہے
ہواؤں میں ہیں شاہانہ ترانے اُبلتے ہیں گلابی سے ترانے
سبو کی آگ سے دہکے ہوئے ہیں فضا میں پھول سے مہکے ہوئے ہیں
چمن بر دوش ہے کوئل کی کو کو صراحی در بغل پھولوں کی خوشبو
کبھی ظلمت، کبھی انوارِ مہتاب خدا معلوم بیداری ہے یا خواب
یہ کیسی طرفگی ہے آج ساقی؟ صراحی میں ہے نور و جہ باقی

اٹھا ساغر، کہ پھر آواز آئی
کہ بدمستی بہ از زاہد ریائی

جُرعۂ سوم

تعالی اللہ شانِ مے پرستی — گھٹا سی ہے گرجتی اور برستی
ندی ساون کی چڑھتی آ رہی ہے — سوئے میخانہ بڑھتی آ رہی ہے
اُٹھی ہیں جھومتی کالی گھٹائیں — گھٹائیں شوخ، متوالی گھٹائیں
اُبلتی ہے شرابِ ارغوانی — برستا ہے مزے لے لے کے پانی
سرِ میخانہ حوریں آ رہی ہیں — نگاہیں، رام، رس ٹپکا رہی ہیں
ہر اک ذرے میں جنباں ہیں زبانیں — زمیں پر لوٹتی پھرتی ہیں تانیں
فنا کی بیڑیاں پھر گل رہی ہیں — بقا کی مشعلیں پھر جل رہی ہیں
ہر اک ذرّہ کھِلا جاتا ہے گویا — گلے آ کر، ملا جاتا ہے گویا
بڑھا جاتا ہوں، دریا ہو کہ وادی — مبارک دولتِ خود اعتمادی!
ہوائیں چل رہی ہیں سنسناتی — مہکتی، سرسراتی، گنگناتی
شریعت پر تباہی آ رہی ہے — مشیّت کو جماہی آ رہی ہے

اُٹھا ساغر، کہ پھر آوازہ آئی
کہ بدمستی بہ از زہدِ ریائی

جرعۂ چہارم

عجب شاہانہ کیفیت ہے طاری
ستاروں پر ہے میرا حکم جاری

زمیں اِس وقت اک وہم و گماں ہے
مرے شہپر کے نیچے آسماں ہے

اَبد کا نور رقصاں ہے جبیں پر
خلا ہے وقت کے سینے کے اندر

ہر اک لمحہ ترانے گا رہا ہے
زمانہ یوں کہ سر لچکا رہا ہے

برستے ہیں فسوں پرور ترانے
اُبلتے ہیں جوانی کے فسانے

مجازی صورتوں پر ہے بحالی
حقائق ہو چکے ہیں لااُبالی

بھٹکتے، رقص کرتے، لڑکھڑاتے
اُمڈتے ہیں مغبچے دھومیں مچاتے

چمکتی ہیں بتوں کی بالیاں سی
فضا پر بج رہی ہیں تالیاں سی

جوانی روح میں اٹھا رہی ہے
نظر پر کاکلیں بکھرا رہی ہے

نہ دل کو امتیازِ این و آں ہے
نہ خود پر بندہ ہونے کا گماں ہے

اٹھا ساغر، کہ پھر آواز آئی
کہ بدمستی بہ از زہدِ ریائی

جرعۂ پنجم

تعالیٰ اللہ شکستِ خود نمائی
بھرا ہے خاک میں نورِ خدائی

فلک پر نشہ سا چھایا ہوا ہے
زمیں کو حال سا آیا ہوا ہے

جوانی ہے زمیں سے آسماں تک
برابر آسماں سے لامکاں تک

چمن میں فصلِ گُل اٹھلا رہی ہے
ہوا پر عمرِ رفتہ رگا رہی ہے

ہتھیلی پہ لئے ہوں گلستاں کو
کہاں کا گلستاں سارے جہاں کو

فلک حیرت سے منہ کھولے ہوئے ہے
زمیں اُڑنے کو پَر تولے ہوئے ہے

فرشتے ہر طرف منڈلا رہے ہیں
پیامی آ رہے ہیں، جا رہے ہیں

نظر میں صورتیں سی پھر رہی ہیں
نقابیں اُٹھ رہی ہیں، گر رہی ہیں

شریعت سے کنارا ہو چکا ہے
مشیت کا اشارا ہو چکا ہے

جبینِ "حال" پر ہے نقشِ "ماضی"
کوئی حد بھی ہے اِن بدمستیوں کی

زمانے کے بعید و متصل مست
دماغِ عقل پرور مست، دل مست

بقا مست و حیاتِ جاوداں مست
فنا سرشار و مرگِ ناگہاں مست

ہوائے تاک و برگِ یاسمن مست
بُتِ نوخیز و صہبائے کہن مست

بلند و پست مست و جزو و کل مست — عنادل مست، گلچیں مست، گل مست

شگوفہ مست و مل مست و چمن مست — زباں مست و دہاں مست و سخن مست

تدبّر مست، حکمت مست، دیں مست — عقائد مست، ظن مست و یقیں مست

ملک مست و فلک مست و قضا مست — قمر مست و قضا مست و فضا مست

مغنّی مست، بربط مست، لے مست — سبو کش مست، ساغر مست، مے مست

خزف مست و صدف مست و گہر مست — ثمر مست و حجر مست و شجر مست

جہاں مست و زماں مست و مکاں مست — عناصر مست، جوہر مست، جاں مست

رواج خیر مست و رسم شر مست — سفالیں کوزہ مست و کوزہ گر مست

یہ ہے بدمستیوں کا زور، ساقی! — محیطِ غیب میں ہے شور، ساقی!

مجھے ارض و سما سے کد نہیں ہے — وگرنہ مستیوں کی حد نہیں ہے

اگر چاہوں تو دنیا کو ہلا دوں — زمیں کیا، آسمانوں کو نچا دوں

فلک کیا، عرش کو بھی پست کر دوں
خودی کیسی، خدا کو مست کر دوں

۱۹۲۳ء

شبِ نشاط

کیا میکدے کی رات نشاطِ آفریں ہے آج
گلرنگ موجِ بادہ سے ان کی جبیں[۱] ہے آج

ہر لغزشِ قدم سے ٹپکتے ہیں زمزمے
ہر جنبشِ نگاہ سرود آفریں ہے آج

شوخی سے ہمکنار ہے چشمِ حیا پرست
تمکیں سے بے خبر نگہِ شرمگیں ہے آج

ہر شے پر آسماں سے برستی ہیں رونقیں
ہر ذرّہ کائنات کا، اک نازنیں ہے آج

جس جامِ زر کو چومیے، لعلِ شکر فروش
جس غنچے کو دیکھیے، زہرا جبیں ہے آج

چھپ چھپ کے پینے والوں کو ملتا نہیں ہے بار
مر مر کے جینے والوں کی پرسش نہیں ہے آج

پھیلی ہوئی ہے عرش سے تا فرش چاندنی
نیلم ہے آسمان، زمرّد زمیں ہے آج

قند و شکر میں غرق ہیں کام و دہن تمام
خُم میں شرابِ تلخ نہیں، انگبیں ہے آج

ساقی کی لے میں بربطِ داؤد کا ہے سوز
صہبا کی بُو میں نکہتِ خلدِ بریں ہے آج

ساغر سے رنگِ عارضِ سلمیٰ ہے آشکار
مینا میں حسنِ لیلیِ محمل نشیں ہے آج

ساقی پر اس بلا کی پھبن ہے کہ الاماں
قربان اک نگاہ پہ دنیا و دیں ہے آج

چھائی ہوئی ہے ارض و سما پر وہ بیخودی
توبہ کہے کہ ہوش میں دنیا نہیں ہے آج

کیوں موجِ بادہ ہو نہ ثریا سے بھی بلند
پائے سبو پہ جوشِ سخن آفریں ہے آج

[۱] میں نے اسی طرح دیکھا تھا۔ (جوشؔ)

آج کی رات

دیدنی ہے مری محفل کا سماں آج کی رات — موجِ صہبا میں ہے رقصِ دو جہاں آج کی رات
تُل گیا ہے کوئی اِس طرح گل افشانی پر — ذرّے ذرّے پہ ہے جنّت کا گماں آج کی رات
قابلِ دید ہے بکھرے ہوئے پھولوں کی بہار — ہر شکن فرش کی ہے کاہکشاں آج کی رات
ایک موہوم سا نقطہ ہے جہاں ارض و سما — ایسا اک دائرہ ہے رطلِ گراں آج کی رات
اثرِ مے سے ہے پگھلا ہوا سونا گویا — عرق آلودہ رُخِ سیم بَراں آج کی رات
پرتوِ بادۂ روشن سے ہے بے گرد و غبار — افقِ عربدۂ زہرہ وشاں آج کی رات
قابلِ ظلم نہیں فطرتِ خوباں اِس وقت — قادرِ جور نہیں طبعِ بُتاں آج کی رات
شمع ہے قابلِ پروانۂ آشفتہ مزاج — حُسن ہے مائلِ صاحب نظراں آج کی رات
آبِ حیواں کا نہ کر ذکر کہ حاصل ہے مجھے — دولتِ قربِ مسیحا نفساں آج کی رات
جوئے کہسار کے مانند گزر عالم سے — یہ ہے فرمانِ جہانِ گزراں آج کی رات
اُف ری ساحل پہ غزلہائے رواں کی ہلچل — اک تلاطم ہے سرِ آبِ رواں آج کی رات
غلغلہ ساز کا ہے، دیرِ مغاں سے بسکہ — تا بہ خلوت گہ حورانِ جناں آج کی رات
جیسے بھیگی ہوئی زلفوں کی مہک عود آمیز — نفسِ شام ہے یوں مشک فشاں آج کی رات
خادمانِ درِ ساقی کے سروں پر کج ہے — کلۂ خواجگیٔ کون و مکاں آج کی رات

حلقہ باندھے ہوئے میخوار ہیں سرگرمِ طواف
جوش ہے قبلۂ رندانِ جہاں آج کی رات

۱۹۲۴ء

کل رات کو

دیدنی تھا میری محفل کا سماں کل رات کو
مہرباں تھا وہ بُتِ نامہرباں کل رات کو
"ناز" تھا طغرا کشِ دیوانِ آدابِ نیاز
"تیغ" تھی ہمپیرِ امن و اماں کل رات کو
چھُو رہی تھی دل کو موجِ رنگ تیروں کے عوض
کھنچ رہی تھی ابروؤں کی یوں کماں کل رات کو
لوٹتی تھی کس تکلّف سے ہوا کے دوش پر
چاندنی میں کاکلِ عنبر فشاں کل رات کو
اللہ اللہ فرشِ مے نوشی کی اوج اندیشیاں
فرشِ پا انداز تھا کون و مکاں کل رات کو
الاماں ٹھنڈی ہوا کے گدگدانے کی ادا
ہر کلی کو آ رہی تھیں ہچکیاں کل رات کو
مسندِ زریں پہ "سرو دلبراں" کے زمرے
تھے بہ اندازِ "حدیثِ دیگراں" کل رات کو

کاکلیں لہرا رہی تھیں روئے عالم تاب پر
سنبلستاں کا تھا گل پر سائباں کل رات کو

پھول تھے غرقِ عرق، پانی ہوئے جاتے تھے جام
سُرخ تھیں اُس شوخ کی یوں انکھڑیاں کل رات کو

آ رہی تھی جنبشِ مژگانِ عالم کی صدا
یوں لبِ گل رنگ تھا افسانہ خواں کل رات کو

کیا تلاطم تھا کہ میری کشتیٔ اُمید میں
کاکلِ شبرنگ کا تھا بادباں کل رات کو

غیب کے پردے سے آوازیں مبارکباد کی
آ رہی تھیں کارواں در کارواں کل رات کو

سامنے تھی جلوہ گاہِ کرسی و لوح و قلم
اک درِ یچہ بن گیا تھا آسماں کل رات کو

ہر سخن میں گونجتی تھی اسمِ اعظم کی صدا
ہر نفس تھا اک حیاتِ جاوداں کل رات کو

وقت کے ہاتھوں پہ روشن تھیں ابد کی مشعلیں
ایسی اک منزل میں تھی عمرِ رواں کل رات کو

وہ ترنم تھا کہ علم و عقل کے ہوتے ہوئے
زیست کی سی شے تھی اِک جنسِ گراں کل رات کو

چاندنی، دریا، شگوفے، راگنی، بربط، شراب
پھٹ پڑی تھیں بزم پر رنگینیاں کل رات کو

نرگسِ مخمور و آبِ آتشیں و موجِ گل
ہر طرف تھیں سرخیاں ہی سرخیاں کل رات کو

گردنِ مینا جھکانے ہی اُبل پڑتے تھے جام
گنگنا اُٹھتا تھا یوں پیرِ مغاں کل رات کو

وجد میں تھی جھلملاتی مشعلوں کی روشنی
رقص میں تھا پرتوِ رطلِ گراں کل رات کو

ناز کرتی جس طرح گردوں پہ جاتی ہے دُعا
اُٹھ رہا تھا مشعلوں سے یوں دُھواں کل رات کو

محفلِ زُہرا میں تھا ہنگامۂ رقص و سرُود
آسماں پر بج رہی تھیں چوڑیاں کل رات کو

میں بھی لافانی ہوں مثلِ وجہِ ربِ ذوالجلال
دل کو ہوتا تھا یہ رہ رہ کر گماں کل رات کو

جوشؔ کے پہلو میں تھیں ارض و سما کی نعمتیں
حیف! اک تو ہی نہ تھا اے رازداں کل رات کو

سنہ ۱۹۳۴ء

رقاصۂ میکدہ

کل رات کو ساقی نے عجب دھوم مچادی
آنکھوں میں جو کھنچتی ہے وہ صہبا بھی پلادی

مے ناز کی نزدیک سے چھلکا کے دمِ رقص
بو دور سے مہکی ہوئی زلفوں کی سنگھادی

آنے لگیں ہونٹوں پہ تبسّم کی جو لہریں
رد کوثر و تسنیم کی آنکھوں میں دکھادی

سر، کیف میں تھوڑا سا جھکا، اور اٹھی آنکھ
گویا درِ مے خانہ کی زنجیر ہلادی

سینے پہ پڑا سر کے جھکانے سے جو سایہ
اُس سایۂ شبگوں نے مری روح جگادی

سرشار جوانی کی وہ بدمست لگاوٹ
لہجے نے چھپالی تو نگاہوں نے بتادی

مستانہ غزل چھیڑ کے بیلا جو اُٹھایا
"قرباں تری آواز کے" زہرا نے صدا دی

نظروں کو کیا شوخیٔ مے لے کبھی آزاد
پلکوں کو حیا نے کبھی زنجیر پہنادی

آشفتہ مزاجوں کو کبھی ناز سے دیکھا
گستاخ نگاہوں کو کبھی آنکھ دکھادی

دنیا کا کوئی ساز جسے پا نہیں سکتا
ہونٹوں پہ زباں پھیر کے وہ دھن بھی بنادی

انگڑائی جو آئی تو کچھ اس ناز سے دیکھا
آنکھوں نے کیا شکر، تمنا نے دعا دی

المختصر آنکھوں میں مری ڈال کے آنکھیں
معلوم نہیں آگ لگادی کہ بجھادی

کیا بات ہے اے جوشؔ! ترے دستِ قلم کی
تُو نے تو شبستر نگاہوں سے گرادی

سنہ ۱۹۲۷ء

جشنِ نو

پھر سبزۂ نو سے زینتِ صحنِ چمن ہے آج
گلشن میں کج کلاہِ گل و یاسمن ہے آج

پھر جامِ زر میں جمع ہے صہبا و نورِ ماہ
پھر اتصالِ جلوۂ گنگ و جمن ہے آج

پھر اہلِ دل کی عقدہ کشائی کے شوق میں
سرگرمِ نازِ زلفِ شکن در شکن ہے آج

تمہیدِ شرحِ صدر رہے پھر شغلِ مے کشی
پھر برقِ طور، موجِ شرابِ کہن ہے آج

پھر عکسِ زلفِ یار ہے قلبِ نگار پر
پھر ابرِ تیرہ صدر نشینِ چمن ہے آج

پھر بوستاں میں طرۂ طرفِ کلاہِ دوست
وجہِ فروغِ افسرِ سرو و سمن ہے آج

پھر خدمتِ نیاز پہ مائل ہے روحِ ناز
پھر زانوئے صنم پہ سرِ برہمن ہے آج

لرزاں تھی جس کے وعدۂ فردا سے زندگی
پہلو میں پھر وہ شاہدِ پیماں شکن ہے آج

زخمِ نگاہِ بد سے بچائے رہے خدا
دیکھو تو کوئی جوش پہ کیا بانکپن ہے آج

سنہ ۱۹۲۵ء

ایک تمنّا

عیدِ گل ہو، اور ہجومِ ساقیانِ سیم ساق
ایسی اِک گردش بھی ہاں اے گنبدِ فیروزہ طاق

یُوں بساطِ عیش پر ہو چنگ و بربط کا خروش
لحن میں تبدیل ہو جائے فغانِ اشتیاق

اپنے اپنے طرز میں ہو ہر شریکِ بادہ فرد
اپنے اپنے رنگ میں ہو ہر حریفِ کیف، طاق

راگ کے شعلوں سے دنیا کو بنا دیں یُوں رقیق
زاہدوں کے آہنیں سینوں میں گل جائے نفاق

جراَتِ رندانہ و جوشِ جنوں ہو، صدرِ بزم
رکھ دیا جائے خرد کا آئینہ بالائے طاق

جھوم کر چھا جائیں مستی کی گھٹائیں رُوح پر
کیسی دُنیا بلکہ خود عقبیٰ کو بھی دے دیں طلاق

گائیں، ناچیں، لڑکھڑائیں، گنگنائیں، تال دیں
دلبرانِ شوخ و شیریں، مہوشانِ چُست و چاق

کاکُلِ برہم سے مہکے سینۂ موجِ صبا
قلقلِ مینا سے گونجے گنبدِ نیلی رواق

خرمنِ حکمت جلا دے مطربوں کی برق نَے
صولتِ عصمت مٹا دے میکشوں کا طمطراق

جیسے ہلکی نیند میں پانی برسنے کی صدا
یاد آئے وصل میں یوں گریۂ شامِ فراق

ایک شب کے واسطے جنت بناؤں دہر کو
مہرباں ہو جائے کاش اے جوشؔ بخت و اتفاق

سنہ ۱۹۳۰ء

دعوتِ نائے و نوش

اُٹھ کہ اے ساقی بدل دیں راہ و رسمِ کفر و دیں
یہ گھٹائیں اور پھر تقوے! نہیں، ہرگز نہیں

آ، کہ پھر لرزاں ہے کوئل کی صدا سے آسماں
اُٹھ، کہ پھر رقصاں ہے ابر و باد سے صحنِ زمیں

آ کہ پھر دریا میں مچلے پرتوِ روئے صبیح
اُٹھ کہ پھر ساغر میں کھیلے عکسِ زلفِ عنبریں

کوکتا ہے پھر پپیہا، جھومتی ہے پھر گھٹا
توڑ دے مُہرِ خموشی، کھول دے چینِ جبیں

محوِ عشرت ہو بہ فرمانِ شبابِ عشوہ کار
گرمِ جلوت ہو بہ زعمِ زاہدِ خلوت نشیں

آ پلا اپنے گدا کو آج ساقی! یوں شراب
آسماں ہو جائے قابو میں، زمیں زیرِ نگیں

اُس جنوں سے کر مجھے سرشار جس کے روبرو
لرزہ بر اندام ہو جاتی ہے عقلِ اولیں

مطربِ رنگیں! بتا دے راہِ صوتِ سرمدی
قُلقُلِ مینا! سُنا دے نغمۂ روح الامیں

توبہ توبہ فصلِ گل میں، اور میں توبہ کروں!
میں کوئی کافر نہیں، الحمد ربّ العالمیں

اس بھری برسات میں طوفان بن کر مے پلا
کھول دے پر پیچ و خم زلفیں، اُلٹ دے آستیں

تند جھونکے تیز بارش مست بادل سرخ جام
آج اے ساقی! زمانہ ہوش میں گویا نہیں

فرصتِ عشرت غنیمت ہے، خدارا ہوشیار
زندگی ہے تیغ بر دست و کفن در آستیں

ناز کر اے یار اپنی دلبری پہ ناز کر
جوش سا مغرور ہے تیرا غلامِ کمتریں

سنہ ۱۹۲۴

پیامِ کیف

علی الصّباح کہ موجِ صبا تھی عنبر بیز — سمندِ فکر کو رقصِ نسیم تھا مہمیز
کھلا رہی تھی شگوفے صبا کی گرمیِ ناز — تپا رہی تھی گلوں کو نمو کی آتشِ تیز!
سماں تھا وادی و کہسار کا نشاط افروز — ادا تھی سرو و گل و یاسمن کی ولولہ خیز
دل و دماغ پہ چھایا ہوا تھا کیفِ سحر — کہ لائی موجِ صبا یہ پیامِ کیف آمیز
"تجھے خبر بھی ہے، اے نو اسیرِ کاکلِ دہر! — کہ ہر نفس ہے یہاں اک طلسمِ حیرت خیز
نظر کی ہے غلطی تختِ قیصر و جمشید — سراب کی ہے چمک تاجِ نادر و پرویز
زمینِ حرص پہ رکھیو ذرا سنبھل کے قدم — کہ اس زمیں پہ ہے خوابیدہ فتنۂ چنگیز
مذاقِ زہد بھی ناقص ہے کہ شیخ کی ہے بساط — رکوعِ کید سرشت و سجودِ مکر آمیز
شرابِ نار طلب کر کہ تجھ پہ کھل جائے — کہ آسماں گہر افشاں، زمیں ہے نکہت بیز
انڈیل ساغرِ زرّیں میں آتشِ سیّال — جو چاہتا ہے کہ ہو نبضِ شادمانی تیز
وہ انجمن ہے حریفانِ بادہ پیما کی — جہاں دوا سے ہے نفرت، دعا سے ہے پرہیز
وہ سرزمینِ ابد ہے دیارِ مے نوشی — جہاں ہے وقت بیے ہر ایک لمحہ گرمِ ستیز
وہ آستاں ہے شبستانِ بادہ خواری کا — جہاں سجود میں ہے بیمِ صبحِ رستاخیز
کسے نصیب یہ دو نعمتیں زمانے میں — شرابِ کہنہ و گل بانگِ ساقیِ نوخیز

فدائے دامنِ صد چاک مے گساراں باد
۱۹۲۶ء "ہزار جامۂ تقویٰ و خرقۂ پرہیز" (حافظ)

جواب اس شب کا دُنیا میں نہیں ہے

جواب اس شب کا دُنیا میں نہیں ہے
مرے پہلو میں پھر وہ نازنیں ہے

فضا پر کھیلتی ہے نوجوانی
ہوا میں مستیٔ وجد آفریں ہے

سبک فانوس میں طرّار شعلہ
بہ رنگِ یوسفِ زنداں گزیں ہے

گلابی میں شرابِ ارغوانی
بہ نازِ لیلیٔ محمل نشیں ہے

معاذ اللہ یہ رنگیں فضائیں
نہیں، دُنیا نہیں، خلدِ بریں ہے

جنوں انگیز کاکل کی درازی
شکستِ زہد کو تہ آستیں ہے

قریبِ شام جیسے غنچۂ گل
گلابی یوں وہ چشمِ سرمگیں ہے

وفورِ کیف میں احساسِ مستی
گماں سا ہے، گماں میں کچھ یقیں ہے

دمک اُس رُخ پہ کچھ ایسی ہے گویا
زمانے کی صباحِ اوّلیں ہے

بخجل ظلمات میں ہے آبِ حیواں
سیہ کاکل کے سائے میں جبیں ہے

مری نظروں کے آگے سرخوشی میں
حجابِ زندگی باقی نہیں ہے

عیاں ہے جوہرِ بالائے گردوں
نمایاں دولتِ زیرِ زمیں ہے

خدا کے واسطے خاموش زاہد
ترے لب پر جہاں ہے اُدھر چیں ہے

وہاں قہرِ خدا کا ذکر، کیا خوب! — جہاں قہرِ خدا مہر آفریں ہے
وہاں ارض و سما کی شرح و تفسیر! — جہاں ارض و سما زیرِ نگیں ہے
وہاں، اور موت کی تشریح پُر ہول! — جہاں موت اک کنیزِ کمتریں ہے
یہاں وہ موت ہے اِک وہمِ باطل — تجھے جس موت کا حق الیقیں ہے
خدا تیرے تخیّل میں ہے "قہار" — بشر یاں "رحمۃ للعالمیں" ہے
یہاں "قہار" بن جاتا ہے "رحمٰن"! — کہ یہ رندی ہے درویشی نہیں ہے
یہاں ہر بوند میں ہے موجِ کوثر — یہاں ہر فرش پر عرشِ بریں ہے
یہاں ہر سانس ہے اِک سیلِ الہام — یہاں ہر نقش اِک نقشِ نگیں ہے
یہاں کی شورشوں میں ہے ترنّم — یہاں کی تلخیوں میں انگبیں ہے
یہاں ہر قہقہہ ہے لحنِ داؤد — یہاں ہر زمزمہ روح الامیں ہے
یہاں ہر سنگ ہے لعلِ بدخشاں — یہاں ہر خار برگِ یاسمیں ہے
یہاں کونین ہے اِک موجِ صہبا — یہاں ارض و سما اک ساتگیں[1] ہے
یہاں ہر جام میں غلطاں ہے کوثر — یہاں ہر جیب میں خلدِ بریں ہے
یہاں ہر مطربِ حُسنِ جوانی — یکے از انبیائے مرسلیں ہے
یہاں ہر غلغلہ ہے خالقِ جاں — یہاں ہر ولولہ دہر آفریں ہے
تری دُنیا ہے زشت و خوب میں گم — مری سرحد ورائے کفر و دیں ہے

[1] شراب کا بڑا پیالہ

مجھے ہر کلیسہ ہے ظن و تخمیں   تجھے ہر واہمہ حق الیقیں ہے
ترا سر ہے شریعت کے قدم پر   یہاں پائے مشیت پر جبیں ہے
مرا پیمانہ ہے یزداں در آغوش   ترا احرام بت در آستیں ہے
زروئے نصِ قرآں نفع مے سے   تجھے انکار کی جرأت نہیں ہے
ارے او عظمتِ عصیاں کے منکر!   "گناہوں" پر مرے کیوں خشمگیں ہے

خلافت ارض کی بخشی ہے جس نے
وہ آدمؑ کا گناہِ اولیں ہے

ندا تو دیکھ اس حسنِ جواں کو   تری آنکھوں میں بینائی نہیں ہے
نظر میں ہے فسردہ داغ لالہ و گل   کمر پر موجِ زلفِ عنبریں ہے
تجمل میں ہے اک شانِ تبسم   تبسم ہے کہ موجِ انگبیں ہے
تکلم میں ہے تسکینِ خموشی   خموشی ہے کہ لحنِ دلنشیں ہے
تخاطب میں ہے اندازِ تغافل   تغافل ہے کہ چشمِ دوربیں ہے
معاذ اللہ یہ الھڑ بادہ نوشی   کہیں چادر ہے، اور کاکل کہیں ہے
لہکتی، گنگناتی، لڑکھڑاتی   جوانی ہوش میں گویا نہیں ہے

صدا یہ دے رہا ہے طور سے کون؟
کوئی کہہ دے مجھے فرصت نہیں ہے!

۱۹۳۲ء

صبحِ میکدہ

میخانے کو صبح جا کے دیکھا — عالم تھا سکوتِ خواب کا سا
ہلکی سی وہ روشنی گلابی — کہتی تھی کہاں گئے شرابی
تھیں فرش پہ سلوٹیں سی ہر سو — زانو سے ملے تھے شب کو زانو
پیدا تھا سکوت سے ترانہ — تھی فرش کی ہر شکن فسانہ
شیشوں سے جو مے چھلک گئی تھی — رودادِ نشاط کہہ رہی تھی
کچھ نقش قدم جہاں بنے تھے — سجدوں کے وہیں نشاں بنے تھے
حجروں کی ہوا بسی ہوئی تھی — خوشبو سے نئی جوانیوں کی
آتی تھی خموشیوں سے ہر بار — رقاصہ کے گھنگروؤں کی جھنکار
شیشوں کے خطوط میں بصد ناز — غلطیدہ تھی ہاؤ ہو کی آواز
گنبد میں تھی محوِ پرفشانی — اربابِ نظر کی شعر خوانی
پردوں میں مچلتی تھیں زبانیں — پھولوں میں بھری تھیں داستانیں
لہریں سی ہوا میں لے رہے تھے — ملبوسِ حریرِ دلبراں کے

بالائے ہوا بنے ہوئے تھے — دزدیدہ نگاہیوں کے جادے

غنچے سے فضا میں کھل رہے تھے — نظروں کے خطوط مل رہے تھے

آئینوں میں کچھ عیاں تھا، کچھ گم — اِک زُہرہ جمال کا تبسم

وہ حجلۂ کیف جس میں شب بھر — تھا مطربِ دل سے ایک محشر

ہنستا ہی تھا، او رنہ رو رہا تھا — جاگا ہوا شب کا سو رہا تھا

نغمے کہ چھڑے رہے تھے شب بھر — آسودہ تھے بام و در کے اندر

حجرے میں تھی رات یوں سمائی — جاذب میں ہو جیسے روشنائی

یوں جذب کیے ہوئے تھے ذرّات — انفاس و تبسم و خیالات

ذرّوں کو کوئی فشار اگر دے

پھر منعقد ایک بزم کر دے

سنہ ۱۹۲۶ء

ہُو

نہ میکشوں کا وہ گُلشن رہا، نہ لالہ رہا — نہ زاہدوں کا وہ زہدِ ہزار سالہ رہا
نہ کوئی دفترِ آداب کا رہا نُسخہ — نہ کوئی مصحفِ انداز کا رسالہ رہا
نہ سوز و ساز کا قائم رہا مقولہ کوئی — نہ علم و عقل کا باقی کوئی مقالہ رہا
نہ اہلِ عیش کے وہ دلفریب لحن رہے — نہ اہلِ درد کا وہ جانگداز نالہ رہا

حریمِ کیف میں تاریخِ رفتگاں بن کر
رہا تو حضرتِ ساقی کا اِک پیالہ رہا

سنہ ۱۹۲۶ء

تاثرات

پروگرام

اے شخص! اگر جوشؔ کو تو ڈھونڈنا چاہے
وہ پچھلے پہر حلقۂ عرفاں میں ملیگا

اور صبح کو وہ ناظرِ نظارۂ قدرت
طرفِ چمن و صحنِ بیاباں میں ملیگا

اور دن کو وہ سرگشتۂ اسرارِ معانی
شہرِ ہنر و کوئے ادیباں میں ملیگا

اور شام کو وہ مردِ خدا، رندِ خرابات
رحمت کدۂ بادہ فروشاں میں ملیگا

اور رات کو وہ خلوتیِ کاکل و رخسار
بزمِ طرب و کوچۂ خوباں میں ملیگا

اور ہوگا کوئی جبر، تو وہ بندۂ مجبور
مردے کی طرح کلبۂ احزاں میں ملیگا

۱۹۳۳ء

وقتِ مروّت

علی الصباح کہ تھی کائنات سر بہ سجود
فلک پہ شورِ اذاں تھا، زمیں پہ بانگِ درود

بہارِ شبنم آسودہ تھی کہ روحِ خلیل
فروغِ لالہ و گل تھا کہ آتشِ نمرود

جلا رہی تھی ہوا، بزمِ جاں میں شمعِ طرب
مٹا رہی تھی صبا، لوحِ دل سے نقشِ جمود

گلوں کے رنگ میں تھی شانِ خندۂ یوسف
کلی کے ساز میں تھا لطفِ نغمۂ داؤد

ہر اک جبیں پہ درخشاں تھا نیرِ اقبال
ہر ایک فرق پہ تاباں تھا طالعِ مسعود

فضائے چرخ میں دوڑی ہوئی تھی روحِ ظہور
بساطِ خاک پہ چھایا ہوا تھا رنگِ نمود

دماغ سے جو ملاتی ہے دل کی سرحد کو
وہ راہِ عقل سبک سر جنوں سے تھی مسدود

حسین خواب سے چونکے تھے رسمسائے ہوئے
مچل رہی تھی ہواؤں میں بوئے عنبر و عود

یہ رنگ دیکھ کے آیا مجھے خیالِ نماز
مری نماز، کہ ہے شاہد و شراب و سرود

مری نماز، کہ ہے مہ وشوں سے راز و نیاز
مری نماز، کہ ہے مغبچوں سے گفت و شنید

مری نماز، کہ ہے نغمۂ ہو الباقی
مری نماز، کہ ہے نعرۂ ہو الموجود

مری نماز کہ ہے عشق ناظر و منظور
مری نماز، کہ ہے حبِّ شاہد و مشہود

مری نماز، کہ ہے ایک سازِ لافانی
مری نماز، کہ ہے ایک سوزِ لامحدود

مری نماز، کہ ہے دیدِ روئے ناشستہ
مری نماز، کہ ہے طوفِ حسنِ خواب آلود

مری نماز "نظر" شیخ کی نماز "الفاظ" | یہاں چراغ، وہاں صرف شمعِ کشتہ کا دود
یہاں ہے رشتۂ انفاس میں ترنم دوست | وہاں ہے دانۂ تسبیح پہ مدارِ درود
وہاں کشاکشِ اغراض سے غمِ کم و کیف | یہاں لطافتِ احساس سے زیاں ہے نہ سود
فغاں، کہ "جنبشِ اعضا" وہاں اساسِ نماز | خوشا، کہ لرزشِ دل ہے یہاں قیام و قعود
کسی مقام پہ حاصل نہیں قرار مجھے | سحر کو ہوں جو برہمن، تو شام کو محمود
غرض کہ آتے ہی وقتِ سحر خیالِ نماز | جبیں تھی پائے صنم پر، زباں پہ "یا معبود!"
تمام رازِ نہاں کھل گئے مرے دل پر | ز تکیہ گاہِ عدم، تا بہ کارگاہِ وجود
سرِ نیاز سے ظاہر ہوا تبسمِ ناز | لطیف خاک سے پیدا ہوا دُرِ مقصود
اُٹھا کے پھر سرِ پُرشوق پائے جاناں سے | کہا یہ میں نے کہ اے سروِ بوستانِ وجود
"بیا، بیا، کہ ترا تنگ در کنار کشیم" | ز بوسہ ہمہ کنجم بر لبِ شکر آلود
مرے لبوں کو بھی دے رخصتِ ترانۂ حمد | ہر ایک ذرہ ہے اس وقت آشنائے درود
یہ سُن کے شرم سے کوئی جواب بن نہ پڑا | جھکی نگاہ، جبیں ہو گئی عرق آلود
جبیں نے بڑھ کے پکارا یہ "کاوشیں بیکار" | نظر نے جھک کے صدا دی "یہ کاوشیں بے سود"

"دہانِ یار کہ درمانِ دردِ حافظ داشت
فغاں کہ وقتِ مروّت چہ تنگ حوصلہ بود"

۱۹۲۹ء

نوجوانی کے مزے

یاد ہیں اب تک وہ عہدِ نوجوانی کے مزے
نوجوانی کے مزے کیا؟ زندگانی کے مزے

وصل کی بادِ خنک میں ہجر کے طوفان میں
کامرانی کے مزے، ناکامرانی کے مزے

بسترِ حرماں پہ خونی کروٹوں کے ساتھ ساتھ
غم کی راتوں میں بلائے آسمانی کے مزے

بادلوں سے جھوم کر، سرشار ساغر چوم کر
جلوہ گاہِ رنگ و بو میں شعر خوانی کے مزے

موجِ بربط، موجِ گل، موجِ صبا کے سامنے
جامِ زریں و شرابِ ارغوانی کے مزے

صبح کی چاندی میں شاخوں کے مچلنے کا سرور
شام کے سونے میں لہروں کی روانی کے مزے

روز اک اندازِ نو سے باہزاراں طمطراق!
حلقۂ احباب میں جادو بیانی کے مزے

مست راتوں میں بہ فیضِ ارتباطِ حسن و عشق
میہمانی کے مزوں میں میزبانی کے مزے

بارہا آ کے زیرِ سایۂ شمشیرِ یاس
شعلہ پرور ولولوں کی سخت جانی کے مزے

روٹھنے اور روٹھ کر ملنے کے دورِ ناز میں
مہربانی کے مزے، نامہربانی کے مزے

صحبتِ ہمراز میں مکتوبِ رنگیں کی بہار
گوشۂ خلوت میں پیغامِ زبانی کے مزے

کمسنی کی خوابگاہوں میں پئے تکمیلِ شوق
جرعہ جرعہ پی کے قصہ، افسانہ خوانی کے مزے

بارگاہِ دلبری میں گاہ فرطِ رعب سے — نقش بر دیوار ہو کر بے زبانی کے مزے
گاہ حرفِ دعوت کی بیکسی سے بچنے کیلئے — جنبشِ مژگاں میں دل کی ترجمانی کے مزے
پھول سے سر رکھ کے اکثر زانوئے پُرشوق پر — گلرخوں کی نیند کی، ماتی جوانی کے مزے
جلوۂ صہبا کی رنگینی بھری برسات میں — آگ کی موجِ رواں کے ساتھ پانی کے مزے
خاکِ راہِ دوست میں اکسیر کی سی نشو خیال — نقشِ پائے یار میں تاجِ کیانی کے مزے
پہلوئے جاناں کی شیریں گرمیوں سے گاہ گاہ — عمرِ فانی میں حیاتِ جاودانی کے مزے
لغزشِ صہبا میں لہجے کا ترنم تول کر — بینشِ خوباں نطق کی گوہر فشانی کے مزے
بدگمانی کے محل پر حُسنِ ظن کے ولولے — حُسنِ ظن کے ولولوں میں بدگمانی کے مزے

التفاتِ یار کے دورِ طرب آہنگ میں
ہر قدم پر جوششِ مرگِ ناگہانی کے مزے

سنہ ۱۹۳۱

جوانی

کیا شرح کروں جوش، جب آتی ہے جوانی
سینے میں عجب دھوم مچاتی ہے جوانی
اک آگ سی پہلو میں لگاتی ہے جوانی
اُس آگ میں پھر دل کو تپاتی ہے جوانی
یوں خاک کو اکسیر بناتی ہے جوانی

اللہ رے جذب و کشش نرگس زیبا
احساس میں آتا ہے وہ طوفان کہ توبہ
پہلو میں کچھ اس طرح مچلتی ہے تمنّا
آغوش میں لے جائے ہوئے بن نہیں پڑتا
اس طرح اشاروں سے بلاتی ہے جوانی

ہر روز قیامت کے نظر آتے ہیں ساماں
ہر صبح سُناتی ہے حدیث رُخ تاباں
ہر شام دکھاتی ہے خم کاکل پیچاں
ہر رات کو، وا کر کے درِ خانۂ خوباں
پہلو میں حسینوں کے بٹھاتی ہے جوانی

ہر آنکھ میں پلکیں ہیں سنبھالے ہوئے بھالے
اِک کھیل ہے، جو سامنے آئے، وہ لبھالے
ہر راہ میں معشوق ہیں گورے ہوں کہ کالے
ہر گام پہ موجود ہیں دل چھیننے والے
ہر بام پہ سو طور دکھاتی ہے جوانی

ہر شے پہ عجب حسن ہے کیا دل کو بچائیں
ہر ذرّہ عالم پہ برستی ہیں ادائیں
ہر سنگ سے اصنام کی آتی ہیں صدائیں
الفاظ ہی ملتے نہیں، کیا تجھکو بتائیں

ہر چیز کو کیا کر کے دکھاتی ہے جوانی

اللہ رے حسنِ کاکل و رنگِ لبِ رخسار
جو سامنے آیا، وہ ہوا دل سے خریدار
زنجیر میں گیسو کی دو عالم ہے گرفتار
صُوفی ہو کہ مے نوش، گدا گر ہو کہ زردار

دیکھو جسے، کھینچے لئے جاتی ہے جوانی

اوروں کا کوئی ناز لبھاتا ہی نہیں ہے
جز اپنے، کوئی دل میں سماتا ہی نہیں ہے،
جلوہ ہو کوئی، رنگ جماتا ہی نہیں ہے
اپنا کوئی ثانی نظر آتا ہی نہیں ہے

اس ناز سے آئینہ دکھاتی ہے جوانی

خوں ریزِ دل آرام کمبخت کی چتون
ظالم کی ہر اک آن ہے تمکین کی دشمن
ممکن نہیں جلنے سے بچا لے کوئی دامن
ہم کیا ہیں، رسولوں کے سلگ اٹھتے ہیں خرمن

بجلی وہ تبسم سے گراتی ہے جوانی

اللہ ری خواب آوری لحنِ خدا ساز
تاروں کا دریچہ کوئی رہتا ہی نہیں باز
یکسوئی وہ ہوتی ہے کہ آتی ہے بصد ناز
مژگانِ دو عالم کے جھپک جانے کی آواز

جب پچھلے پہر ساز اٹھاتی ہے جوانی

اللہ ری خوبانِ مجازی کی حکومت
معشوقِ حقیقی کو بھی ہو جاتی ہے حیرت

پیرانِ کہن سال کا پندارِ عبادت　　منہ ڈھانپنے لگتا ہے بہ افراطِ ندامت

اصنام کے یُوں نام اُٹھاتی ہے جوانی

قطروں سے اُبلتے ہیں شرابوں کے سمندر　　ذرّوں میں دمکتے ہیں دُرِ صاعقہ پرور

آئینوں کے اندر نظر آتا ہے سکندر　　خاشاک کے سینے میں جھلکتے ہیں گُلِ تر

ہر بُت کو خدا کر کے دکھاتی ہے جوانی

ہر برگ میں اک رنگ ہے، ہر رنگ میں گلزار　　ہر خار میں اک پھول ہے، ہر پھول میں رُخسار

ہر شاخ میں اک لوچ ہے، ہر لوچ میں تلوار　　ہر موج میں اک رقص ہے، ہر رقص میں جھنکار

تصویر پہ تصویر بناتی ہے جوانی

اسلام کے سینے میں لرز اُٹھتا ہے قرآں　　کیا کفر کی قوت ہے کہ دب جاتا ہے ایماں

گھبرا کے نکل آتے ہیں کعبے کے نگہباں　　اُڑ جاتے ہیں مسجد میں مؤذن کے بھی اوساں

یوں دَیر کی زنجیر ہلاتی ہے جوانی

سنہ ۱۹۲۷ء

جوانی کی رات

شب کہ حریمِ ناز میں شورِ صد اضطراب تھا — عشق بھی تھا برہنہ سر حُسن بھی بے نقاب تھا

آنکھوں میں رُوئے یار تھا آنکھیں تھیں روئے یار پر — ذرہ تھا آفتاب میں ذرّے میں آفتاب تھا

خشک تکلفات کی ٹوٹ چکی تھیں سب حدیں — چشمک بے دریغ تھی خندۂ بے حجاب تھا

حُسن کی بزمِ عشوہ میں شمعِ وفا تھی ضو فگن — عشق کی بارگاہ میں، زمزمہ باریاب تھا

سر پہ صُراحیاں لیے رقص کناں تھے مُغبچے — نرگسِ نیم باز میں، رنگِ شرابِ ناب تھا

معرکۂ عظیم تھا ناز میں اور نیاز میں — زلف میں بھی تھی برہمی، دل کو بھی پیچ و تاب تھا

موجِ ہوا میں عطر تھا، چھٹکی ہوئی تھی چاندنی — پھول تھے صحنِ باغ میں، چرخ پہ ماہتاب تھا

عشق کی نبضِ تیز میں دوڑ رہی تھیں بجلیاں — حُسن کے دستِ ناز میں شعلہ فشاں رباب تھا

پرتوِ یار اس طرف، رامش و رنگ اس طرف — چشم بھی فتح مند تھی، گوش بھی کامیاب تھا

درد سے قلب چُور تھے کیف سے روح مست تھی — سوز بھی بے نظیر تھا، ساز بھی لاجواب تھا

ہونٹوں کو وقتِ گفتگو چُومتی تھی شگفتگی
بات جو تھی، سو پھول تھی، پھُول جو تھا گلاب تھا

اور سحر کو ہمنشیں! آنکھ کھُلی تو کیا کہوں — طاق میں شمع کشتہ تھی چرخ پہ آفتاب تھا

توبہ شکن گلابیاں لرزش پہ چُور چُور تھیں — خُلد فروش جامِ زر، شرم سے آب آب تھا

نغمۂ رقص و بےخودی، جلوۂ حُسن و شاعری — شب کو تھا بحرِ بیکراں، وقتِ سحر سراب تھا

بربط و چنگ کی صدا، ایک فسُردہ گونج تھی — شمع و شراب کا سماں، ایک پریدہ خواب تھا

لرزشِ بادو خمِ زلفِ سیاہ کے عوض — تھا تو چراغِ کشتہ کے دُود کا پیچ و تاب تھا

گُنبدِ قصرِ عیش میں گونج رہی تھی یہ صدا
رات نہ تھی وہ کیف کی، جوشِ ترا شباب تھا

سنہ ۱۹۲۳ء

یہ کھلونا؟

یہ کھلونا؟ نہیں مرے معصوم — آگ اس کو سمجھ کے دُور سے تاپ

میرے ننھّے سے ماہتاب! نہ رو — آ سُلا دے تھپک کے مفلس باپ

سنہ ۱۹۲۵ء

جوانی کے ساز و برگ

کچھ کسک سی دل میں، کچھ آنکھوں میں آنسو آبدار
گاہ دردِ بے نوائی، گاہ کربِ انتظار

ہجر کی کچھ خشمگیں تاریکیوں کا پیچ و تاب
وصل کی کچھ دلنشیں راتوں کا نورِ ماہتاب

چند وقفے خوش دلی کے، چند گھڑیاں جبر کی
کچھ تمنّائیں شبِ مہتاب روزِ ابر کی

کچھ لگاوٹ، کچھ ستم، کچھ نرمیاں، کچھ گرمیاں
گاہے ماہے چند راتیں مہ وشوں کے درمیاں

کچھ دنوں تلخ و زبوں شامِ بلا کی تیرگی
کچھ شبوں میں پھول سے مکھڑوں کی میٹھی چاندنی

کچھ دنوں کچھ ظلمتِ ہول آفریں گرمِ عتاب
چند لمحے کچھ سنہری کنگنوں کی آب و تاب

کچھ تمنّاؤں کے انگارے دلِ صد چاک میں
جستجو کی کچھ خراشیں دیدۂ نمناک میں

چند سانسیں صبر کی چلتی ہوئی تلوار پر
چند نیندیں روح فرسا کروٹوں کی دھار پر

کچھ فراغت کی امنگیں، کچھ مسرت کی نمو
زانوؤں کے چند تکیے، کچھ تبسم کے سبو

دو گھڑی کے واسطے احباب سے راز و نیاز
چند لمحوں کے لئے گل رنگ باہوں کا گداز

چند لمحے بے کلی کے، چند وقفے طیش کے
چند جرعے سرخوشی کے، چند نغمے عیش کے

کچھ دنوں بھیگی ہوئی راتوں کا لطفِ بے قیاس
شکریں باتوں کا رس، شاداب چہروں کی مٹھاس

کچھ تبسم نرم کلیوں کی طرح کھلتے ہوئے
چند چہرے چودھویں کے چاند سے ملتے ہوئے

ساعدوں کی چند شمعیں، عارضوں کے کچھ گلاب　　کچھ رخوں کی سرخیاں، کچھ مست آنکھوں کی شراب
کچھ خنک لہجوں کی شبنم، کچھ ترانوں کی پھوار　　کچھ لبوں کا شہد، کچھ زلفوں کا عطرِ مشکبار
لطف کے دو ایک دن، تفریح کی ایک آدھ رات
اے جوانی! تھی تری لے دے کے اتنی کائنات
پھر بھی وہ تیرا سبک پرواز عہدِ مختصر　　خندہ زن ہے آج تک عمرِ مسیح و خضر پر
وقت کی خونریزیوں پر بڑھ کے پانی پھیر دے
ان دنوں کی ایک ہی شب، اے جوانی پھیر دے

سنہ ۱۹۲۹ء

نظّارۂ ماضی

دیوی ہے سحر کی جلوہ گستر
جھونکے ہیں نسیم کے معطّر

خاموش ندی پہ ہے دھواں سا
سبزے پہ ہے دھوپ کا گماں سا

کیا مست ہوائیں آ رہی ہیں
"کوکو" کی صدائیں آ رہی ہیں

پڑتا ہے اثر نہ جانے کیونکر
کوئل کی صدا کا حافظے پر

ظالم کی صدا ہے دل کے اندر
کھلتا ہے گزشتہ عہد کا در

کیا حال ہے جوشِ دل ہوا راضی
پھرتا ہے نظر میں دورِ ماضی

احساس میں کیا ہے توازن
سینے کی گرہ صدا کا ناخن

ہیں پیشِ نظر ندیمِ ہمراز
"شکووں" میں بدل رہی ہے آواز

راتیں وہ خنک وہ سرد صبحیں
بیدار ہوئی ہیں میرے دل میں

رگ رگ میں بپا ہے اک تلاطم
ہاں ہاں یہ انہیں کا ہے تبسّم!

آئینۂ شوخی و جوانی
تھا جس پہ مدارِ زندگانی

جنکی آنکھیں تھیں دورِ ساغر
ہاں ہاں یہ وہی ہے ماہ پیکر!

لب پر جو بنی ہوئی ہیں آہیں — یہ تو ہیں اِس کی نیم باہیں
تانیں یہ سرور کی سُریلی — لہجے میں جھجک یہ کمسنی کی
سامان تھے سب یہ اتفاقی — اب صرف "خیال" میں ہیں باقی

ان میں ہیں کچھ کہ سو رہے ہیں
کچھ "شعر" میں صرف ہو رہے ہیں

۱۹۲۷ء

ٹھنڈی انگلیاں

مُردہ انگلی اپنے مفلس باپ کی پکڑے ہوئے — رو رہا ہے ایک بچہ اک دکاں کے سامنے
اک کھلونے کی طرف انگلی اٹھا کر بار بار — کچھ نہیں کہتا ہے لیکن رو رہا ہے بار بار
باپ کی جھکتی ہوئی آنکھوں میں ہے دنیا سیاہ — رُخ پہ گردِ مفلسی ہے جیب خالی پر نگاہ
باپ کی نمناک آنکھوں میں ہے تکمیلِ یاس — کیا قیامت ہے پسر کے آنسوؤں کا انعکاس
دل ہوا جاتا ہے بچے کے بلکنے سے فگار — کہہ رہا ہے زیرِ لب فریاد اے پروردگار

وہ کیا تقدیر ہے اِس بندۂ معصوم کی
ہو چلی ہیں انگلیاں ٹھنڈی مرے معصوم کی

۱۹۲۵ء

ایک قدیم سیرگاہ کو دیکھ کر

آ نکلے ہو تو، دم بھر ٹھہرو ذرا عزیزو
ہم اس زمیں پہ کیا کیا فتنے جگا چکے ہیں

کیسی یہ جلد بازی، دم بھر تو سوچنے دو
یاں دامنوں کے کیا کیا پرزے اڑا چکے ہیں

ہاں، یہ وہی ندی ہے جس میں نہا نہا کر
کتنے ہی ساونوں میں طوفاں اٹھا چکے ہیں

ساحل پہ کرم خوردہ یہ کشتیاں وہی ہیں
جن میں خم و سبو سے دریا بہا چکے ہیں

یہ سبزہ ہے، جہاں ہم سوئے ہوؤں کے مُنہ پر
صہبا چھڑک چھڑک کر اکثر جگا چکے ہیں

ہاں، یہ وہی چمن ہے جس میں فروغِ مے سے
کلیاں ہی کمسنوں کے رُخ پر کھلا چکے ہیں

دیکھو یہ سائباں ہے جس سائباں کے نیچے
کیا کیا جوانیوں کی عیدیں منا چکے ہیں

ہاں، اس طرف یہ دیکھو رنگین وادیاں ہیں
اِن وادیوں میں کیا کیا دھومیں مچا چکے ہیں

ہاں، جوشؔ یہ مناظر قائم رہیں ابد تک
اس رنگ و بو میں کیا کیا شفق آ چکے ہیں

۱۹۳۳ء

مفلسوں کی عید

اہلِ دُوَل میں دھوم تھی روزِ سعید کی
مفلس کے دل میں تھی نہ کرن بھی اُمید کی

اتنے میں اور چرخ نے مٹی پلید کی
بچّے نے مسکرا کے خبر دی جو عید کی

فرطِ محن سے نبض کی رفتار رُک گئی
ماں باپ کی نگاہ اُٹھی اور رُک گئی

آنکھیں جھکیں کہ دستِ تہی پر نظر گئی
بچّے کے ولولوں کی دلوں تک خبر گئی

زلفِ ثبات غم کی ہوا سے بکھر گئی
برچھی سی ایک دل سے جگر تک اُتر گئی

دونوں ہجومِ غم سے ہم آغوش ہو گئے
اِک دوسرے کو دیکھ کے خاموش ہو گئے

۱۹۳۲ء

مختار احمد خاں[1]

اے رفیقِ شفیق، اے مختار
میرے دیرینہ مونس و غمخوار

بذلہ سنج و ظریف و نکتہ شناس
خوشدل و خوش بیان و خوش گفتار

اے کہ سودائے عشق تیرا چلن
اے کہ ذوقِ نگاہ تیرا شعار

اے کہ سینے میں تیرے خوابیدہ
میرے طفلی کے ساز کی جھنکار

ہائے وہ سرزمینِ سیتاپور
ہائے وہ لکھنؤ کے لیل و نہار

ہائے وہ "انجمن" کی شامِ طرب
ہائے وہ گومتی کی صبحِ بہار

ہائے "لاٹوش روڈ" کے خم و پیچ
ہائے نخاس کے در و دیوار

ہائے بوٹا سا وہ عزیز[2] کا قد
ہائے کھلتا سا وہ رخِ دیدار[3]

ہائے وہ "پار[4]" کے رخ و کاکل
ہائے وہ چوک کے لب و رخسار

ہائے وہ سبزۂ امین آباد
ہائے وہ چار باغ کے انوار

ہائے وہ گل رخانِ کلکتہ
ہائے وہ دمہ و شانِ "شالامار"

---

[1] مختار احمد خاں ملیح آبادی [2] عبدالعزیز خاں ملیح آبادی جو بہ غایت پستہ واقع ہوئے ہیں [3] دیدار حسن خاں ملیح آبادی [4] لکھنؤ کا ایک محلہ جو گومتی کے اُس پار واقع ہے۔

ہائے وہ بد مذاقی "مُلّا"[1] ہائے وہ کج ادائی اغیار
ہائے وہ شورشِ رفیع[2] و شرر[3] ہائے وہ بذلہ سنجیِ ابرار[4]
ہائے وہ سازِ میرزا[5] و نذیر[6] ہائے وہ سوزِ عشق و مدحِ نثار
ہائے رُتّے "شریف"[7] کی سُرخی ہائے نور الحسن[8] کی شانِ وقار
وہ ظفر[9] کا خرامِ بے پروا وہ عطا[10] کی جبینِ ساعنبر بار
ہائے گم ہو گئے کدھر وہ دن؟ ہائے کیا ہو گئے وہ لیل و نہار؟

تو مؤرخ ہے عہدِ ماضی کا
عمرِ رفتہ کا تو فسانہ نگار
تجھ میں مضمر مری حکایتِ گل تجھ میں پنہاں مری حدیثِ بہار
تو سلامت رہے ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

سنہ ۱۹۲۲ء

---

[1] نام یاد نہیں۔ لاٹوش روڈ کی پشت پر رہتے تھے۔ اور ہماری خوش مذاقیوں سے ناخوش رہا کرتے تھے۔
[2] رفیع احمد خاں۔ ایم اے سابق پروفیسر کیننگ کالج لکھنؤ [3] احسن میرزا صاحب شرر لکھنوی [4] ابرار حسن خاں اثر ملیح آبادی [5] شاہزادہ میرزا جہانگیر قدر بی اے ڈپٹی کلکٹر [6] شیخ محمد نذیر صاحب جو کچھ دن ملیح آباد میں ہیڈ ماسٹر رہ چکے ہیں [7] محمد شریف ایک دوست [8] نور الحسن خاں ملیح آبادی [10] عطا حسین لکھنوی خلف میرزا قاسم حسین ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس۔

مختار واپس آ[1]

اے سمندر! اے شبِ مہتاب کے آئینہ دار
تیری چوپائی پہ ہر جنبش ہے پیغامِ بہار

سوئے مغرب تیرے سینے پر رواں ہے اک جہاز
عشق کی دنیا میں ہے جو کعبۂ سوز و گداز

آہ اس میں اک مسافر ہے شہیدِ آرزو
کشتۂ موجِ ہوائے گل، ہلاکِ رنگ و بو

اے سمندر! اپنی دنیا تک ہے تو شاید کام
اس کو لہروں کی زبانی میرا پہنچا دے پیام

روکے یہ کہنا کہ اے شاعر کے دیرینہ حبیب
اے بلاکش! اے وطن آوارہ! اے غربت نصیب

اے زمانے کی ہزاروں سختیاں جھیلے ہوئے
اے مرے ہمراز! میرے ساتھ کے کھیلے ہوئے

بمبئی تیری زیارت کے لئے آیا تھا میں
دل میں اک دنیا ہجومِ شوق کی لایا تھا میں

ابرِ غم میں چھپ گئی کشتی ہلالِ عید کی
رہ گئی گھٹ کر مرے دل میں تمنا دید کی

کس طرف لیکر چلا ہے تجکو قلبِ ناصبور؟
آہ اے چشم و چراغِ دودمانِ رامپور[2]

تو سوئے لندن رواں ہے بے ندیم و غمگسار
اور کن حالات میں! جن کا تصور ناگوار

رونے والے! وہ تری خلقی ظرافت کیا ہوئی؟
وہ ترے اجداد کی شانِ امارت کیا ہوئی؟

---

[1] مختار احمد خاں ملیح آبادی [2] یہ معزز خاندان رامپور سے آکر ملیح آباد میں آباد ہوا تھا۔

اب تک آویزاں ہیں وہ نقشے دلِ برباد میں
آہ جب رہتے تھے ہم دونوں ملیح آباد میں

لکھنؤ کی آج بھی وہ رنگ رلیاں دل میں ہیں
پہلے جو زیرِ قدم تھیں، اب وہ گلیاں دل میں ہیں

ہائے سیتاپور کی وہ روح پرور سرزمیں
ہائے خیرآباد کے وہ مہ وشانِ شہرگیں

وہ ہوائیں، وہ گھٹائیں، وہ فضا، کچھ بھی نہیں
اب فقط اک داغ ماضی کے سوا کچھ بھی نہیں

اے مریضِ دردِ دل، اے عاشقِ آشفتہ کار
آہ یہ صدمے، تری مجبوریوں کے میں نثار

اُف یہ کیسا پیچ ہے تقدیر کا ڈالا ہوا
یوں نہ محنت کر، کہ تو نازوں کا ہے پالا ہوا

گوش بر آواز ہوں تیری صدا کے واسطے
جلد اے مختار واپس آ، خدا کے واسطے

۱۹۲۵ء

الوداع[۱]

اے ملیح آباد کے رنگیں گلستاں، الوداع
الوداع، اے سرزمینِ صبحِ خنداں، الوداع
الوداع، اے کشورِ شعر و شبستاں، الوداع
الوداع، اے جلوہ گاہِ حسنِ جاناں، الوداع

تیرے گھر سے ایک زندہ لاش اُٹھ جانے کو ہے
آ گلے مِل لیں کہ آوازِ جرس آنے کو ہے

آ، کلیجے میں تجھے رکھ لوں مرے "قصرِ سحر"[۲]
اس کتابِ دل کے ہیں اوراق تیرے بام و در
جا رہا ہوں، تجھ میں کیا کیا یادگاریں چھوڑ کر
آہ کتنے طور خوابیدہ ہیں تیرے بام پر

روح، ہر شب کو نکل کر میرے جسمِ زار سے
آ کے سر ٹکرائے گی تیرے در و دیوار سے

ہائے کیا کیا نعمتیں مجھکو ملی تھیں بے بہا
یہ خموشی، یہ کھلے میداں، یہ ٹھنڈی ہوا
وائے یہ جاں بخش بستاں، ہائے یہ رنگیں فضا
مر کے بھی ان کو نہ بھولے گا دلِ درد آشنا

مست کوئل جب دکن کی وادیوں میں گائیگی
یہ سُبک چھاؤں ببولوں کی بہت یاد آئیگی

کل سے کون اس باغ کو رنگیں بنانے آئیگا
کون پھولوں کی ہنسی پر مسکرانے آئے گا

---

[۱] دکن جاتے ہوئے یہ نظم کہی گئی تھی [۲] مصنف کے مکان کا نام

کون اس پنجرے کو موتے سے جگانے آئیگا کون ان پودوں کو سینے سے لگانے آئیگا
کون جاگے گا قمر کے ناز اٹھانے کے لئے
چاندنی راتوں کو زانو پر سلانے کے لئے

آم کے باغوں میں جب برسات ہوگی پُرخروش میری فرقت میں لہو روئے گی چشمِ مے فروش
رس کی بوندیں جب اڑا دینگی گلستانوں کے ہوش کنجِ رنگیں میں پکاریں گی ہوائیں "جوش جوش"
سن کے میرا نام موسم غمزدہ ہو جائیگا
ایک محشر سا گلستاں میں بپا ہو جائیگا

صبح جب اس سمت آئیگی برافگندہ نقاب آہ کون اس دل کشا میداں میں چھیڑیگا رباب
اس افق پر شب کو جب انگڑائی لیگا ماہتاب چاندنی کے فرش پر لہرائیگا کس کا شباب
جگمگائیگی چمن میں پنکھڑی کس کے لئے
رنگ برسائیگی ساون کی جھڑی کس کے لئے

گھر سے بے گھر کر رہی ہے آہ فکرِ روزگار سرنگوں ہے فرطِ غیرت سے اب وجد کا وقار
خلعتِ ماضی ہے جسمِ زندگی پر تار تار پھر بھی آنکھوں میں ہے آبائی امارت کا خمار
شمع خلوت میں ہے روشن، تیرگی محفل میں ہے
رخ پہ گردِ بیکسی، شانِ ریاست دل میں ہے

کوچ کا پیغام لے کر آگیا مہرِ منیر گھر کا ہے وقتِ ماتم زدہ ہیں برنا و پیر

رخصتِ بلبل سے نالاں ہیں چمن کے ہمصفیر　　آرہی ہے کان میں آوازِ گویا[1] و بشیر[2]

چھُٹ رہا ہے ہات سے دامن ملیح آباد کا

رنگ فق ہے عزتِ دیرینۂ اجداد کا

کیا بتاؤں، دل پھٹا جاتا ہے میرا ہمنشیں　　آئیں گے یاں خرمنِ اجداد کے جب خوشہ چیں

آکے دروازے پہ جیسے ہی جھکائیں گے جبیں　　گھر کا سناٹا صدا دیگا "یہاں کوئی نہیں!"

جودو بخشش کا کلیجہ غرقِ خوں ہو جائیگا

میرے گھر کا پرچمِ زر سرنگوں ہو جائیگا

آہ، اے دَورِ فلک! تیرا نہیں کچھ اعتبار　　مٹ کے رہتی ہے ترے جورِ خزاں سے ہر بہار

نوعِ انساں کو نہیں تیری ہوائیں سازگار　　فکرِ دُنیا، اور شاعر، تف ہے اے لیلِ ونہار

موجِ کوثر وقف ہو اور تشنہ کامی کے لئے

خواجگی رختِ سفر باندھے غلامی کے لئے

آگلے مل لیں، خدا حافظ گلستانِ وطن!　　اے "امانی گنج"[3] کے میدان، اے جانِ وطن

الوداع اے لالہ زار و سنبلستانِ وطن　　السّلام اے صحبتِ رنگینِ یارانِ وطن

حشر تک رہنے نہ دینا تم دکن کی خاک میں

دفن کرنا اپنے شاعر کو وطن کی خاک میں

---

[1] حسام الدولہ تہور جنگ نواب فقیر محمد خاں المتخلص بہ گویا [2] نواب محمد بشیر احمد خاں بشیر رئیسِ اعظم ملیح آباد۔

[3] جہاں مصنف نے نظارۂ مناظر کی خاطر آبادی سے باہر مکان تعمیر کیا تھا۔

غریب الوطن کا پیام

اے چاند! جگمگا کر، مکھڑا دکھانے والے
غرفے سے آسماں کے، اے مسکرانے والے

عالم کی کیا حقیقت تیرے سفر کے آگے
اس وقت اِک جہاں ہے تیری نظر کے آگے

جکڑا ہوا پڑا ہوں زنجیر سے دکن کی
سینے میں آرزو ہے بچھڑے ہوئے وطن کی

کس زندگی کی دُھن میں پیہم رواں دواں ہیں
جو ساتھ کھیلتے تھے، وہ لوگ اب کہاں ہیں؟

شاداب تو ہیں میرے بچپن کی سیر گاہیں؟
اب ڈھونڈتی ہیں جن کو ترسی ہوئی نگاہیں

اچھی تو ہیں پروں کو دُھن میں جھٹکنے والی
دیوار پر وہ آکر چڑیاں چہکنے والی؟

چھائی ہیں میرے دل پر کیوں بدلیاں محن کی؟
مجروح تو نہیں ہیں صبحیں مرے وطن کی؟

"میداں"[1] تو میرے غم میں کھویا ہوا نہیں ہے؟
"قصرِ سحر"[2] کا منہ تو اترا ہوا نہیں ہے

محفوظ تو ہیں اب تک طوفاں کا رواں سے
زخمی ہوئی وہ راہیں کھیتوں کے درمیاں سے؟

کیا اب بھی جھومتی ہیں کرتی ہوئی اشارے
پتلی سبک ببولیں تالاب کے کنارے

بدلی میں گونجتے ہیں آموں کے باغ اب بھی؟
جلتے ہیں جنگلوں میں دھندلے چراغ اب بھی؟

۱؎ امانی گنج کا میدان جہاں مصنف نے نظارۂ قدرت کی خاطر مکان تعمیر کیا تھا۔ ۲؎ مصنف کے مکان کا نام۔

اے چاند جب ستارے گردوں پہ جھلملائیں

جب قدرتی مناظر صحرا میں مسکرائیں

تاروں کی کشمکش میں جب چاندنی ہو پھیکی — چادر سرک گئی ہو ماتھے سے جب کسی کی

بے داغ جب زمیں ہو، اور آسمان کورا — جب سینۂ افق پر غلطاں ہو سُرخ ڈورا

مغموم جھاڑیوں سے میرا سلام کہنا — آنکھوں میں اشک بھر کر پھر یہ پیام کہنا

کیوں میرا سوزِ فرقت تم کو جلا رہا ہے؟ — کیوں مضطرب ہو؟ ٹھہرو، وہ دن بھی آ رہا ہے

جس دن دھڑکنے والے دل کو قرار ہوگا

سائے میں جب تمہارے میرا مزار ہوگا

سنہ ۱۹۲۵ء

درد انگیز کھلونا

ہاں یہی ہے وہ کھلونا اے دلِ آشفتہ حال
کھیلتا پھرتا ہے جس سے ایک طفلِ خورد سال

ہاں یہی ہے وہ کھلونا دیکھ چشمِ اشکبار
جس کی حسرت میں کسی بچے کا دل ہے بیقرار

اس کھلونے کی سبک گل کاریوں کے درمیاں
ثبت ہیں اک تیرہ قسمت باپ کی محرومیاں

اس کا آب و رنگ ہے آئینہ عبرت فزا
یہ مگر رنگِ پریدہ ہے کسی مایوس کا

اس کے آئینوں میں ٹکڑے ہیں دلِ محروم کے
اس کی تابانی میں آنسو ہیں کسی معصوم کے

اس میں غلطاں ہے کسی بچے کا شوقِ مضمحل
اس کے سینے میں دھڑکتا ہے کوئی ننھا سا دل

کھیل دولت مند بچے! تو سدا پھولے پھلے
ہم ادھر ہنستے ہوئے آئے تھے اور روتے چلے

۱۹۲۵ء

انگیٹھی

بچپن کی اے اداس انگیٹھی! خدا گواہ
کیا کہیے تجھ پہ آج پڑی کس طرح نگاہ

تو اور خاکِ سرد پہ یوں مثلِ سوگوار!
افسوس اے زمانۂ طفلی کی یادگار

میری ہی طرح کیا ترا پہلو بھی سرد ہے؟
کیا تیرے آئینے پہ بھی ماضی کی گرد ہے؟

افسوس وہ نشاط کے موسم، وہ زمزمے
جاڑوں کی دلفریب وہ راتیں، وہ چہچہے

شعلوں سے تیرے ہلتے وہ اٹھتا ہوا دھواں
وہ قہقہوں کی گونج وہ شیریں پہیلیاں

خوشبو وہ تیری آنچ کی جاں بخش و دل نواز
وہ تیرگی میں رنگ ترا، دل میں جیسے راز

شعلے وہ سرخ سرخ، دلوں میں تلے ہوئے
وہ سرخیوں میں نرم تبسم گھلے ہوئے

شعلوں کے بار بار وہ اندازِ دل نشیں
دم بھر میں زرنگار تو دم بھر میں سرمگیں

ڈوبی ہوئی حیات میں تیری وہ گرمیاں
وہ گرمیوں میں لطف کے قصوں کی نرمیاں

وہ سادگی کی بزم میں بجتے ہوئے ستار
کلیوں کا کونپلوں کی چٹکنا وہ بار بار

وہ غنچگی کا عہد، وہ گل باریاں تری
اڑتی ہوئی ہوائیں وہ چنگاریاں تری

وہ نرم نرم جسم، وہ تیری حرارتیں
وہ قمقمہ داریوں سے عجب شرارتیں

وہ چھوکرے ادب سے وہیں پہ کھڑے ہوئے
دایاؤں کے سروں پہ وہ آنچل پڑے ہوئے

دن کی صفوں میں وہ مغلانیوں کی شان — رکھّا ہوا وہ تخت پہ چاندی کا پاندان
وہ تیرے گرد و پیش، بصد شانِ افتخار — آواز پاندان کے کھُلنے کی بار بار
شایانِ آفریں وہ خواتین کا شعار — شوخی کے رنگ میں بھی وہ اک نوع کا وقار
وہ ہیکلیں گلوں میں، لبوں پر وہ لالیاں — ہلتی ہوئی وہ کانوں میں سونے کی بالیاں
وہ لونڈیوں کے رُخ پہ نشانِ خاک دھول کے — جوڑے وہ اونچے اونچے، وہ مُوباف تول کے
وہ مرد و زن لحافوں کے اندر گھٹے ہوئے — رعب آفریں دروں میں وہ پردے چھٹے ہوئے
وہ نچلے بیٹھنے سے طبیعت کا انتشار — پہلو رضائیوں میں بدلنا وہ بار بار
ہلکی رضائیوں کی وہ افسانہ باریاں — اطلس کی سُرخ گوٹ پہ وہ سُرخ دھاریاں
وہ ”ایک بادشاہ“ کی بیٹی کا ذکرِ خیر — وہ ولولے جنوں کے، وہ پریوں کا شوقِ سیر
وہ مرحمت میں غرق بڑی بوڑھیوں کی ذات — وہ کاٹنا ڈلی کا کہانی کے ساتھ ساتھ
وہ اک عجیب شانِ طرب سے ملی ہُوئی — شیریں حکایتوں میں سروتوں کی راگنی
کیوں اب بھی یاد ہیں وہ لڑکپن کے زمزمے؟ — اے شمعِ خوابگاہِ فراغت جواب دے!

جن کو بھلا رہی ہیں ہماری جوانیاں
اب اُن میں تجھکو یاد ہیں کتنی کہانیاں؟

سنہ ۱۹۲۷ء

اُترے ہوئے چہرے

آہ وہ لوگ کہ تھے میرے لڑکپن میں ظریف — جن کو ہنسنے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا
میرے آبا کی لگاتار نوازش کے طفیل — رنگ رلیوں ہی میں کٹتا تھا زمانہ جن کا
اُن کے بعد اب ہیں کچھ اس درجہ ملول و غمناک — کہ اُنہیں دیکھ کے پھٹتا ہے کلیجہ میرا
میرا افلاس ملاتا نہیں اب اُن سے نگاہ — میرے اجداد کی دولت کا تھا جن پر سایا
جس سے رہتی تھی شریفوں کے خط و خال میں آب — کیا ہوا دورِ فلک! وہ مرے گھر کا نقش
دیکھتی کاش جوانی بھی مری شاد اُنہیں — مست تھا جن کے لطیفوں سے لڑکپن میرا
دستِ خالی کی طرف دیکھ کے رہ جاتا ہوں — اُن کا چہرہ نظر آتا ہے جب اُترا ہوا
آہ اُن میں سے ہر اُترا ہوا چہرہ اے جوشؔ — مقبرہ ہے مرے اجداد کی فیاضی کا

فرطِ غم سے قدم اُٹھتے نہیں بڑھنے کیلئے
کتنی قبریں ہیں یہاں فاتحہ پڑھنے کے لئے

سنہ ۱۹۳۰ء

ماں جائے کی یاد

ہیں دیس میں تم وطن سے باہر — اے بھائی! بہن نثار تم پر
انگنائی میں ہو رہا ہے غوغا — ساون کی رُت ہوا ہے پُروا
سلئے ہیں گرجتی بدلیوں کے — استادہ ہیں دو شتر پہ بچّے
اِک موج رواں ہے اک چمن ہے — اک خیر سے بھائی! اک بہن ہے
کچھ دیر سے دونوں لڑ رہے ہیں — کیا جانے کیوں جھگڑ رہے ہیں
میں دیکھ رہی ہوں اور چُپ ہوں — کس جی سے بھلا فساد کاٹوں
اِس جنگ کے آئینے کے اندر — بچپن ہے ہمارا جلوہ گستر

کرتے تھے شرارتیں اُدھم بھی
لڑتے تھے اِسی طرح سے ہم بھی

سنہ ۱۹۳ء

بہن کی یاد

کندہ ہے اِس ظرفِ شکستہ پہ یا رب! کسکا نام
آہ! اب اِس نام کا مفہوم ہے زہرِ ہزار

دل پھٹا جاتا ہے میرا، آہ! اے ظرفِ ملول
آ کہ رکھ لوں دل میں! اے میری بہن کی یادگار

وہ بہن! شاداب تھے جس سے روایاتِ قدیم
وہ بہن! تابندہ تھا جس سے اب و جد کا وقار

اِسکے حرفوں پر نظر پڑتے ہی اک مدت کے بعد
پھر گئی آنکھوں کے نیچے عہدِ طفلی کی بہار

دائروں میں اسکے، ماضی کو مچلتا دیکھ کر
ہو گیا کچھ اور بھی دُکھتا ہوا دل بے قرار

خون رو! اے میری قسمت! او وقتِ بیری! خُون رو
اِسکے نقطوں سے ہے بچپن کا تلاطم آشکار

گھر کی انگنائی میں گویا کھیلتا پھرتا ہوں میں
دل کو رہ رہ کر یہ دھوکا ہو رہا ہے بار بار

نیم میں جھولا پڑا ہے لپک رہی ہیں پُریاں
پڑ رہی ہے ہلکی ہلکی مست بھادوں کی پھوار

پینگ لے لیکر مزے سے گا رہے ہیں باغ میں
"نیم کی نکولی پکّی، آئی ساون کی بہار"

"میکے لیتے آ گیا جگ جگ جیئے بیرن مرا"
رکھ دے اِس طوفان میں بند اُلٹے ڈولی کہار

صحن میں پانی بھرا ہے اور پائیں باغ سے
آ رہی ہے بارہ ماسے کی صدا دیوانہ وار

خود بخود سینے میں رہ رہ کر بھر آتا ہے دل
گو سمجھ میں کچھ نہیں آتی پپیہے کی پکار

چھوڑ دو، طفلی کے لمحو! مجکو تنہا چھوڑ دو

صبر و تمکیں کا ہوا جاتا ہے دامن تار تار

جیتے جیتے ہو چکے ہیں جوش کو چھتیس سال — ایک دل، اور اتنے ماہ و سال کا پُرہول بار!

داد دے معبود! اس دردِ نہاں کی داد دے — یہ لطیفِ احساس، یہ طولِ حیاتِ مستعار

زندگی! اُف زندگی! سینے میں گھبراتا ہے دم — خالقِ جاں! توڑ دے اِس قید خانے کا حصار

جب ستارہ ٹوٹ جاتا ہے قسم اُس وقت کی — تیرِ مرگِ ناگہاں کا تیر میں تیرے نثار

رحم فرما، زہرِ ہستی اب پیا جاتا نہیں

اب ترے بندے سے اے مولیٰ! جیا جاتا نہیں

سنہ ۱۹۳۳ء

خدا سے ایک سوال

مادی عہد میں یہ ناداری
کون اپنی کرے گا غمخواری

کس طرف جائیں کس سے بات کریں
ہر طرف ایک جمود سا ہے طاری

کس سے کہئے کہ اپنی صحبت ہے
بدتر از صد ہزار بیماری

اہلِ افلاس غرقِ رشک و حسد
اہلِ دولت رہینِ غداری

اُٹھ گیا ہائے دوستی کا چلن
لُٹ گیا ہائے شہرِ دلداری

جس کے چہرے پہ فکر کے آثار
اُس کی صورت سے سب کو بیزاری

مطمئن ہستیوں کا دُنیا میں
مشغلہ ہے غریب آزاری

قدرداں کون ہے زمانے میں
علم و فن کی ہے سرد بازاری

افترا ہے وسیلۂ توقیر
راستی وجہِ ذلت و خواری

حجِ اکبر طوافِ کیسۂ زر
حمد و تہلیل حرفِ عیّاری

جزوِ ایماں مذاقِ بغض و نفاق
راہِ عرفاں شعارِ مکّاری

نظر آتی ہے اہلِ دانش میں
سیرتِ شاہدانِ بازاری

مایۂ صد نشاطِ روحانی
اہلِ دولت کی کفش برداری

اپنی تکمیل سے ہے شرمندہ
میری تخئیل کی فسوں کاری

بے خبر سو رہی ہے اک دنیا
منفعل ہے ہماری بیداری

فرقِ اغیار پر چمکتا ہے
ہند کا افسرِ جہانداری

اس تلاطم میں ہم ادیبوں کی
کیا ضرورت تھی ایزدِ باری

سنہ ۱۹۲۲ء

مُطالعہ و نظر

دیدہ ور آنکہ، تا نہد دل بشمارِ دلبری
در دلِ سنگ بنگرد، رقصِ بتانِ آذری
(غالب)

(۱۹۲۷ء تا ۱۹۳۳ء)

گرہ یوں کھل رہی ہے ہر نفس ذوقِ نظارہ کی
کہ ہر ادنےٰ سی شے اب ایک عالم ہوتی جاتی ہے

(جوشؔ)

حوض میں مستانہ بط کے تیرنے سے جس طرح	کائی میں پڑتا چلا جاتا ہے خطِ رہ گزر
حافظے پر یونہیں اک بیدار کن گہری خراش
ڈال دیتی ہے شبِ غم میں پپیہے کی پکار

مسکرایا خواب میں اس طرح اک طفلِ صبیح	جس طرح صہبا کی لرزش سے دمک اٹھے ایاغ
اور اس نرمی سے، جیسے بتکدے کے طاق میں	جھٹپٹا ہوتے ہی روشن کر دیا جائے چراغ

خاکِ گلشن پہ دھندلکے کی المناکی میں	یوں ہیں پامال شگوفوں پہ نقوشِ بیداد
عید کے چاند پہ جس طرح نظر پڑتے ہی	دل میں معصوم یتیموں کے ہو ماں باپ کی یاد

رکھے ہوئے سونے کا طبق، ناز سے سر پر	کہرے میں نظر آتی ہے، یوں صبحِ درخشاں
ہو جاتی ہے جس طور سے انساں کی شرافت	ہنگامۂ افلاس میں کچھ اور نمایاں

ساحلِ عثمان ساگر کی چٹانوں پر سے موج	یوں گزر جاتی ہے اکثر برق کی رفتار سے
جیسے اٹھتی ہے دلِ مفلس میں موجِ انبساط
اور اٹھتے ہی گزر جاتی ہے قلبِ زار سے

کثرتِ عصیاں کی گہری تیرگی میں گاہ گاہ   سامنے آتی ہے فکرِ عاقبت یوں بے نیام

جیسے حملے کے لئے بیتاب بھوکے شیر کی

جھاڑیوں میں سے چمک اُٹھتی ہیں آنکھیں وقتِ شام

وداعِ طفلی و قربِ شباب کے باعث   تری "نگاہ" ہے بادہ "خیال" دل افروز

بدل رہا ہے جو پہلو، ضمیرِ شاعر میں   اور آب و تاب سے موزوں نہیں ہوا ہے ہنوز

رہرووں کو دُور سے پہچاننے کے واسطے   سعی کی جاتی ہے یوں دُھندلی شبِ مہتاب میں

جس طرح اِنسان کی سیرت پرکھنے کے لئے   ٹھوکریں کھاتی ہیں نظریں ظاہری آداب میں

بنا چکتا ہے جب نومشق، اِک حلقہ سا تودے پر   نشانہ باندھ کر چٹکی میں اپنی، تیر لیتا ہے

چلانا چاہتا ہے یونہیں غم جب چھُری اپنی   خوشی کا ہار پہلے اُس گلے میں ڈال دیتا ہے

اب بھی فکرِ دل سے اگر دم بھر کو پاتا ہوں نجات   ناتواں دل میں کھٹک جاتی ہے یوں بار بار

صبح، کچی نیند سے جس طرح چونک اُٹھنے کے بعد

کمسنی کی بھولی سی آنکھوں میں چھُپتا ہے خمار

چاند جب گردوں پہ آتا ہے برافگندہ نقاب	دفعۃً کجلا سے جاتے ہیں ستاروں کے شرار
روبرو یونہیں جب آجاتا ہے وہ ماہِ تمام
ماند پڑ جاتے ہیں آنکھوں میں سرشکِ انتظار

وصل کی راتوں میں اب اس طرح سے آتا ہے یاد	ہجر کے عہدِ زبوں کا گریۂ صبح و مسا
جیسے اکثر نیند میں کروٹ بدلتے وقت جوش آ	کان میں آتی ہے ہلکی موجِ باراں کی صدا

بوندیوں کا سلسلہ ہے اور ہلکے ابر سے	پڑ رہی ہیں اس طرح سبزے پہ کرنیں گاہ گاہ
وقتِ گریہ جس طرح مکتوبِ غم لکھتے ہوئے	آنسوؤں سے چھن کے آتی ہے سرِ کاغذ نگاہ

ایک ہلکی سی مسرت ایک مبہم سی خوشی	روح میں کچھ یوں مچلتی ہے بوقتِ پیچ و تاب
جیسے ہلکے ابر میں موہوم سا خطِ ہلال	یا کسی بیمار بچّے کا تبسّم وقتِ خواب

کیا بتاؤں کہ وہ دمِ گلگشت	کس مزے سے قدم اٹھاتی ہے
جیسے کلیوں پہ رشحۂ شبنم
جیسے آنکھوں میں نیند آتی ہے

صبح کے ہنگام جیسے مدرسے کی گھنٹیاں
طفل کے ذوقِ شکر خوابی کو کرتی ہیں نڈھال
یونہیں بیتاب و تواں بچوں کے مفلس باپ کی
نیند اُڑا دیتا ہے "اے خوابِ اجل" تیرا خیال

شاد و فرحاں ہیں نئے احباب تیرے لطف سے
سرد مہری سے قدیم احباب کا رُخ زرد ہے
یہ تری سیرت ہے ایسے تیز موٹر کی طرح
جسکے آگے روشنی ہے اور پیچھے گرد ہے

شب کو اکثر کھلی تاریکیاں میدان کی
رُوح پر کرتی ہیں طاری اس طرح خوابِ گراں
دل سمجھتا ہے کہ مجھ پر غم سا ہے چھایا ہوا
جس طرح کہرے پہ ہو جاتا ہے بارش کا گماں

پھاڑتے ہی جیسے میلا چیتھڑا اڑتی ہے گرد
یونہیں، وہ دو شخص جو اک دوسرے سے ہیں خفا
گفتگو کرتے ہیں جب آپس میں ازراہِ نفاق
دیکھتا ہوں انکے ہونٹوں سے غبار اڑتا ہوا

جھٹپٹے کے وقت کوندے کا لپکنا بار بار
ظلمتوں پر مارتا ہے جس طرح تھم تھم کے تیر
یونہی وحشت ناک عصیاں کی اندھیری رات میں
آدمی کے قلب کو رہ رہ کے ڈستا ہے ضمیر

شب کو سونے جنگلوں میں جگنوؤں کے رقص سے — کانپ کانپ اٹھتی ہے کچھ یوں تیرگی بے اختیار

جس طرح مایوس راتوں کی فضائے تنگ میں

نیم جاں امید جھپکاتی ہے آنکھیں بار بار

کیا کہوں کس طرح آنکھیں کھولتی ہے نوعروس — منہ اندھیرے جیسے نرگس کی کلی بنتی ہے پھول

غنچۂ خاطر کی یا جس طرح کھلتی ہے گرہ — دل پہ یا جس طرح شعرِ کیف پرور کا نزول

خشک ہو کر سایہ بخشی کی نہیں رہتی جب آس — حالتِ اشجار یوں اُس وقت ہوتی ہے سقیم

جیسے آنکھوں میں گدا کی دیکھ کر عزمِ سوال — سر جھکا لیتا ہے فرطِ شرم سے مفلس کریم

غبار اک دوسرے پر پھینکتے ہیں تیز رو موٹر — مخالف سمت سے ہمدوش ہو کر جب گزرتے ہیں

یونہیں دو مدبر اشخاص جب ملتے ہیں آپس میں — نئی تاریکیاں اک دوسرے سے اخذ کرتے ہیں

دشت ہے تاریک اور رہ رہ کے کوندے کی لپک — چھو رہی ہے یوں اُفق کی ظلمتِ خاموش کو

جیسے اُس مایوس کی آنکھوں کا عالم جو غریب

حال کہنا چاہتا ہو، اور کہہ سکتا نہ ہو

تیرہ جنگل کی گھنی شاخوں کے گہرے سائے ہیں   بہہ رہی ہے جھٹپٹے کے وقت کچھ اس طرح نہر

جس طرح گیسوئے پیچاں کی درازی کا غرور

قامتِ خوباں میں بہتا ہے اِک نازک سی نہر

گندھے پھولوں میں چھپ جاتا ہے جیسے ہار کا ڈورا   یونہیں آنکھوں سے جب دل کی گھٹا برسائی جاتی ہے

تمام اپنی لطافت غرق کر دیتی ہے اشکوں میں   وہ موجِ کیف سینے میں جو غم کے پائی جاتی ہے

شبِ مہ میں جھلک کر سرمئی بادل کے ٹکڑوں سے   جمالِ ماہِ تاباں یوں کلی پہ رقص کرتا ہے

ہجومِ ناز و فرطِ شرم کے طوفان میں جیسے   تبسم مد بھری آنکھوں سے ہونٹوں پر اترتا ہے

کڑی دھوپ آگ برساتی ہے جب گلزارِ عالم پر   تخیل ابر کا ہوتا ہے سبزے کے تبسم میں

یونہی خوں ریز و خوں آشام نادارس کو ہستی کی   مرادِ دل تولتا ہے تیری رحمت کے تصور میں

مِل رہے ہیں دونوں وقت اور گر رہا ہے حوض میں   اِک کھنک کے ساتھ فوارے کا پانی اس طرح

خامشی سے چھیڑتی ہے نرم و غمگین راگنی

شیب کی راتوں میں یادِ نوجوانی جس طرح

شب کو اِک پُرسکون محفل کا — آ کے موٹر مٹ گیا ایماں تر
جس طرح آئے، وقتِ بادہ کشی
کان میں مے فروش کی آواز

جیسے موٹر کی گریزاں روشنی سے راہ میں — نصف لمحے کیلئے ظلمت پہ چھا جاتا ہے نور
سرمدی آلام کے مارے ہوئے اِنسان کو — یونہیں چھو جاتی ہے دم بھر کیلئے موجِ سرور

اِس طرح تیرگی میں ہوتا ہے — خوف کا قلبِ طفل میں آغاز
جس طرح رات کی خموشی میں — سانپ کی اتار پر آواز

وقتِ شب کچھ اور بھی تاریک کر جاتا ہے یوں — اپنی چمکائی ہوئی ظلمت کو موٹر کا غبار
جس طرح کاندھے پہ رکھ کر ہات دم بھر کو خوشی — دوش پہ غم کا نیا اک اور رکھ جاتی ہے بار

ہوا پُرشور ہے، ابر ہے موسم کی یورش ہے — لبِ ساحل شگفتہ چاندنی مرجھائی جاتی ہے
یونہیں آزردہ انفاس آئینے کی سی حالت
عزیزوں کی شکر رنجی کی تہ میں پائی جاتی ہے

نرم ہو جاتا ہے پلپس سے جو پک کر پھوڑا　　پیشترِ نشترِ جرّاح سے ہوتا ہے فگار
فرشِ گُل کی یونہیں ہو جاتی ہے خوگر جو قوم
ہونا پڑتا ہے اُسے خارِ مُغیلاں سے دوچار

پیشِ اربابِ نظر مشکور ہو سکتی نہیں　　یہ تری اظہارِ بے مہری کی سعیِ متصل
یوں تغافل ہیں ترے غلطاں ہے موجِ التفات　　پردۂ اشعار میں جس طرح سے شاعر کا دل

رات ہے اور چاند حجرے کے　　سُرخ شیشوں سے آ رہا ہے نظر
فرطِ گریہ سے چشمِ عاشق میں　　جیسے روئے نگار، وقتِ سفر

شام ہوتے ہی یہ کیسا ہو گیا ہے آسماں؟　　حاشیے پر روشنی ہے، وسط میں تاریکیاں
کیوں نڈر ہو کر نہ میں کہدوں کہ یہ طرفہ سماں　　ہُو بہُو ایسا ہے، جیسے عصرِ حاضر کے جواں

صبح طالع ہو رہی ہے اور فضائے شہر میں　　کھا رہا ہے پیچ و خم تاریک کہرے کا دھواں
شہر کی مخلوق، یوں گلیوں میں آتی ہے نظر
خواب میں جس طرح سے دیکھے کوئی پرچھائیاں

ایک دلکش ہلیح چہرے پر صبح کی ہیں ملاحتیں طاری
جیسے نمکین چیز میں، اے جوشؔ! ایک ہلکی، مٹھاس کی دھاری

باغ پر ہیں جھکے ہوئے بادل ٹُو ہے جھونکوں میں سرد پانی کی
کُنج پر چھائی ہے، وہ کیفیت نیند جس طرح نوجوانی کی

تلملاتی مچھلیوں کی شوخیوں سے جس طرح سطحِ پر تالاب کی، پڑتے ہیں حلقے بار بار
یونہیں دل کی لرزشِ پیہم کے ہاتوں ہر نفس میری چشمِ تر میں رہتی ہے تمنّا بے قرار

بھولی بھٹکی ہوئی جنگل میں پرندے کی صدا کوئی آوارہ سا جھاڑی میں ہوا کا جھونکا
ٹُو کے طوفان میں تپتے ہوئے ذرّوں کی لپک کرب کے ساتھ کڑی دھوپ میں پودوں کی لچک
غنچہ زرد کا پامال عقیق و یاقوت گھانس پر دھوپ کی ماری ہوئی تتلی کا سکوت
کرّۂ ناز سے چیلوں کی لرزتی آواز بوکھلائے ہوئے بھونروں کی پریشاں پرواز
سُرخ ذرّات، پہ کھائے ہوئے مٹنے کی قسم رہروِ تشنہ کے مرجھائے ہوئے نقشِ قدم

یوں ہے ان سب میں تپاں حسرتِ باران و سحاب
آئے پردیس میں جس طرح سے یادِ احباب

جس طرح گنجان باغوں کی ہوا، وقتِ غروب — شام کے انفاس سے بنتی ہے آہِ سوگوار
کُنج سے آتی ہے اِک مرطوب بوجھل سی شمیم — منجمد سی بھاپ ہوتی ہے لبِ جوئبار
سینۂ خنکی پہ ہوتا ہے حرارت کا دباؤ — حسرتِ شبنم میں خوں روتی ہے چشمِ برگ و بار
یونہیں ہو جاتے ہیں جب کچھ دن انہیں دیکھے ہوئے — رُوح ہو جاتی ہے بوجھل اور سینہ تنگ و تار
اُٹھنے لگتی ہے برابر، ہر بُنِ مو سے اک آنچ — جس سے آتی ہے تمنّا کی شمیمِ سوگوار

اور کچھ آنکھوں میں یوں آنسو مچلتے ہیں ندیم
ماہِ تاباں کا ستاروں کو ہو جیسے انتظار

پھول مٹھی میں اگر کچھ دیر تک رہتے ہیں بند — ہات میں ہوتی ہے پیدا، اک معطّر سی نمی
یونہی جب کچھ دیر کرتا ہوں تصوّر حُسن کا — سانس میں ہوتی ہے خوشبو اور آنکھوں میں تری

اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ جاناں نے مجھے
بھینچ کر آغوش میں تا دیر چھوڑا ہے ابھی

سنایا مجھے ایک مطرب نے آج — وہ نغمہ، کہ تھا دل میں سویا ہوا
جوانی کی راتوں میں یادش بخیر — جسے چھیڑتا تھا کوئی مُرلف
کچھ اِس طرح نغمے کا ہر زیر و بم — مری سمت آنکھیں اُٹھانے لگا
کسی اجنبی شہر میں جس طرح — کوئی بھُولا بچھڑا ہُوا آشنا

سرِ راہ لوگوں کے انبوہ سے
بڑھے یک بیک مسکراتا ہوا

شام کا وقت، گاؤں کا میدان — سادہ رُخ، سرو، سرنگوں، سنسان
سلسلے کوہسار کے تا دُور — سامنے صرف اِک غنودہ کھجور
جیسے اِک تشنۂ جواب ''سوال'' — جیسے غربت میں دوستوں کا ''خیال''

سر سے نزدیک ہو گئے اِک طائر — یُوں اُڑا صبح، نیند جیسے آئے
نصف لمحے کے واسطے، مجھ کو — گیت اِس طرح شہپروں کے سنائے
ذہن سے جس طرح کہ بات کوئی — یاد آتے ہی محو ہو جائے

جس طرح اے حسنِ خود بیں نبض کا وہ رُوحِ کوہ — روز و شب اِک لرزشِ پیہم سے بنتے ہیں دوچار
کاہ کے دل میں مچلتا ہے لشکرِ رنگ و بُو — تابشِ خورشید و موجِ بادِ باراں کا شرار
کوہ میں فرطِ خموشی سے ناتراشیدہ صنم — ڈھونڈتے ہیں بُت تراشوں کی نظر دیوانہ وار

یوں ہیں میرے مضمحل جوہر، مرے افسردہ عزم
تیرے بانکے سے تبسّم کے لیے ہیں بے قرار

نسیب[1]

حُسنِ جنبید خواب مُژہ برہم زد
فتنہ برپا شد و نشتر بہ رگِ عالم زد

(نظیری)

[1] "نسیب" عربی میں اس شاعری کو کہتے ہیں جس میں حسن و عشق کا ذکر ہو۔

عاشقِ نواز

میری پرستش اور تیری بزمِ ناز — آفریں اے شاہدِ عاشق نواز

میں سراپا خاک اور میرے لئے — سلسلہ جنبانیٔ ناز و نیاز

اِک مرے دل کی تسلّی کے لئے — زلزلے میں آئے اور تمکینِ ناز

تیری طبعِ ناز اور آشفتگی — تیرا پہلو، اور خراشِ جانگداز

یہ تیرا رُخ اور رنگِ خستگی — یہ ترے لب اور حدیثِ سوز و ساز

تیرا سینہ، اور میری آرزو — میری محفل، اور تیری شمعِ ناز

تیرا دل، اور کاہشِ سوزِ نہاں — تیرا سر، اور زانوئے سوز و گداز

آہِ سوزاں، اور تیرے لعلِ لب — اشکِ خونیں، اور تیری چشمِ ناز

خارِ حسرت، اور ترا قلبِ رقیق — گردِ حرماں، اور تری زلفِ دراز

میرا دامن، اور وقفِ اشکِ غم — تیرا سینہ، اور بارِ حرفِ راز

آہ وہ اور اس طرح جھک کر ملے — خود اٹھاتی ہو جوانی جس کے ناز

جس کے قدموں پر ہو خود فطرت کا سر
وہ پڑھے، اور مجھ سے ملنے کو نماز

اُس کے دل سے پُوچھیے غم کا مزا
"دل شکن" جسکے لیے ہو "دل نواز"

مُفت دو جانیں تلف ہونے کو ہیں
سُن رہا ہے اے خدائے بے نیاز؟
مہرباں ہو اے انیسِ بے کساں
رحم فرما اے کریم کارساز

ابر میں ہے سنگباری کی گرج
آئینوں کو دیکھ اے آئینہ ساز

سنہ ۱۹۲۳ء

اسے کیا کہتے ہیں

جب ادا سے وہ سامنے آئی
ہمنشیں ہیں اُسے نہ دیکھ سکا
اور جب آنکھوں سے ہو گئی اوجھل
میں نے جی بھر کے اُسکو دیکھ لیا

کچھ کہا اُس نے اور میں سن نہ سکا
اور جب وہ چلی گئی کہہ کے
میرے کانوں نے سُن لیا وہ بھی
جو کہا بھی نہ تھا ابھی اس نے

سنہ ۱۹۲۳ء

چاند کے انتظار میں تارے

کس نے وعدہ کیا ہے آنے کا
حُسن دیکھو غریب خانے کا

رُوح کو آئینہ دکھاتے ہیں
در و دیوار مسکراتے ہیں

آج گھر، گھر بنا ہے پہلی بار
دل میں ہے خوش سلیقگی بیدار

غرق ہے رُوح خوش جمالی میں
نظم ہے طبع لااُبالی میں

جمع ساماں ہے عیش و عشرت کا
خوف دل میں فریبِ قسمت کا

سوزِ قلبِ کلیم آنکھوں میں
اشکِ امید و بیم آنکھوں میں

چشم بر راہ، شوق کے مارے
چاند کے انتظار میں تارے

رات بھیگی، شگفتہ ہارہُوا
رنگ کلیوں میں آشکار ہُوا

ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں میں مچلی
ہلکی ہلکی مہک چنبیلی کی

وعدہ جنجال بن گیا جی کا
رنگِ امید ہو چلا پھیکا

اک جہانِ چشم تر میں گرد ہُوا
دل وہ دھڑکا کہ رنگ زرد ہُوا

دفعتہً اِک چمک سی دوڑ گئی
بام و دَر پر جھلک سی دوڑ گئی

دل میں چمکی اُمید کی بجلی
انگلیاں اور ہو گئیں ٹھنڈی

الاماں شوقِ دید کی یورش
بڑھ گئی اور خون کی گردش

اپنی حدِّ وفا ہوئی محسوس
اُن کی آوازِ پا ہوئی محسوس

چھا گئی بام و در پہ رعنائی
دل میں لی وَلوں نے انگڑائی

جل اُٹھی شمع دل کے محبس میں
صبح گویا ہوئی بنارس میں

فرطِ شادی سے بوکھلا سا گیا،
دل میں احساس شادمانی کا

تارِ نظروں کے دمبدم کانپے
لڑکھڑائی زبان، قدم کانپے

نہ رہا سلسلہ وہ آہوں کا
رشتہ سمٹا مری نگاہوں کا

آئے وہ اشک تھم گئے بارے
چاند نکلا تُنک ہو گئے تارے

۱۹۲۳ء

پھول

یہ کس نے جوشؔ کو بھیجے ہیں نازپرور پھول
شگفتہ پھول، جواں پھول، خلد پیکر پھول

ہوائے ناز سے چٹکے ہوئے سبک غنچے
شمیمِ زلف سے مہکے ہوئے معطّر پھول

شعاعِ حُسن سے دہکے ہوئے خنک شعلے
لبِ نگار کے چُومے ہُوئے سخنور پھول

نسیم کاکلِ شب گوں سے پرفشاں گلبرگ
فروغِ نرگسِ شیریں سے خواب آور پھول

ارم سے آئی ہوئی حرفِ آرزو کلیاں
خدائے ناز کے بھیجے ہوئے پیمبر پھول

پلٹ کے اے خلشِ نوکِ خار کے شاکی
اُسے بھی دیکھ، جسے ڈس رہے ہیں کافر پھول

سنہ ۱۹۲۳ء

پہلی مفارقت

چاند سے عہدِ وصل کی باتیں
ہائے فرقت کی چاندنی راتیں

آفتیں جمع ہیں جدائی کی
چاندنی رات ہے جدائی کی

کوئی کافر ہی شب کو سوتا ہے
رات بھر دل میں درد ہوتا ہے

اُٹھتی رہتی ہیں بار بار آنکھیں
ڈھونڈتی ہیں جمالِ یار آنکھیں

کچھ وہ تکیوں سے آتی ہے خوشبو
نیند آتی نہیں کسی پہلو

چھیڑتا ہے جو کوئی رات کو ساز
صاف آتی ہے یار کی آواز

آگ سی پہلوؤں میں جلتی ہے
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جو چلتی ہے

مُرغ جب صبح کو جگاتے ہیں
چونکتے ہی وہ یاد آتے ہیں

شغل مرگ و حیات کی راتیں
ہائے وہ التفات کی راتیں

بے نتیجہ ہے صبر کی تلقین
بلکہ دیتا ہے جب کوئی تسکین

شعلۂ غم بھڑک کے نکلتا ہے
اور بھی دل دھڑکنے لگتا ہے

ہر نفس آہ ہر سخن نالہ   سم ہے آب و ہوائے بنگالہ[۱]

اے اودھ کی نسیمِ عقدہ کشا   وہ ملیں تو پیام یہ کہنا

بادلوں کی طرح برستی ہیں   آنکھیں دیدار کو ترستی ہیں

اُٹھتی رہتی ہے ہوک سی پیہم   ہائے وہ رُخ، وہ کاکلِ برہم

ہائے وہ چاندنی وہ مہتابی   مست آنکھوں کی وہ شکر خوابی

برگِ گُل پر وہ ماہتاب کی ضَو   رُخ پہ وہ آمدِ شباب کی رَو

خال و خد سے عیاں بصد انوار   صبحِ صادق کی چاندنی کا نکھار

ہاں تو اے دلنشیں اودھ کی صبا   وہ ملیں تو پیام یہ کہنا

بادلوں کی طرح برستی ہیں   آنکھیں دیدار کو ترستی ہیں

ایک مدت ہوئی نہیں دیکھا   ہائے وہ تیرا چاند سا مکھڑا

اس طرح صبح و شام ہوتی ہے   دل دھڑکتا ہے، آنکھ روتی ہے

گھلے جاتا ہے کوئی سینے کو   آگ لگ جائے ایسے جینے کو

تنگ ہے سانس آنے جانے سے
اب بُلا لے کسی بہانے سے

سنہ ۱۹۲۳ء

۱؎ یہ نظم کلکتے میں کہی گئی تھی۔

زرد کلیاں

بھیجی ہیں کسی نے بہرِ درماں — بیلے کی چمن فروز کلیاں
ڈوبی ہوئی عطرِ کم سِنی میں — دونے کی مہین کوری سینکیں
کلیوں سے مگر عیاں ہے زردی — یہ رُوحِ غم ان میں کس نے بھر دی؟
گویا ہیں زبانِ حال سے یُوں — اے شاعرِ خوش نصیب و محزوں
بھیجا ہے چُھپا کے ہم کو جس نے — جانے اُسے غم دیئے ہیں کس نے
یوں زرد وُہ روئے دلنشیں ہے — اِک چھینٹ بھی خون کی نہیں ہے
ہم سے کہا ہے، جا کے کہنا — لازم نہیں اب خموش رہنا
مجھ کو تری یاد نے ڈبویا — مرجھائی ہوئی کلی ہوں گویا
بھرتی ہوں چھپا کے شب کو آہیں — ہٹتی نہیں چاند سے نگاہیں
شاما جو سحر کو بولتی ہے — آنکھوں کی گرہ کو کھولتی ہے
لب خشک ہیں، مُنہ ہے اُترا اُترا — پنڈا کب سے ہے پھیکا پھیکا
چہرے سے عیاں ہے دل کی اُلجھن — ڈھیلے ہیں کلائیوں کے کنگن
اللہ یہ کیا ہوا ہے مجھ کو — دیکھو جسے دیکھتا ہے مجھ کو

اب حد سے سوا ہے خستہ حالی — نزدیک ہے وقتِ پائمالی

آنا ہو تو آ کہ دل ہے بیتاب — ایسے میں ابھی چمن ہے شاداب

جلد آ کہ فروغِ رنگ و بو ہو

قبل اِس کے خونِ آرزو ہو

سنہ ۱۹۲۳

تجاہلِ عارفانہ

کیوں صبح یوں عرق میں نہائے ہوئے ہو تم؟ — شاید کسی خلش سے کے جگائے ہوئے ہو تم

اُلجھا ہوا ہے کرب سے ہر رشتۂ نفس — گو دیکھنے میں زلف بنائے ہوئے ہو تم

جن مشغلوں میں کھیلتی رہتی تھی کم سنی — اُن مشغلوں سے ہاتھ اُٹھائے ہوئے ہو تم

شاید یہ اہتمام ہو اخفائے راز کا — ہمجولیوں سے آنکھ چرائے ہوئے ہو تم

خود کو لئے دیئے ہو مگر کہہ رہے ہیں طور — سینے میں ایک حشر چھپائے ہوئے ہو تم

کیا جوشؔ نامراد کو دیکھا ہے خواب میں

یوں صبح کو جو شام بنائے ہوئے ہو تم!

سنہ ۱۹۲۳

عقدۂ لاینحل

درسِ عبرت ہے یا اولی الابصار　　میرا افسانۂ دلِ بیمار
یہ فسانہ نہیں حقیقت ہے　　شاعری سے نہیں مجھے سروکار
دل میں ہیں جذبہائے گوناگوں　　اُلجھی جاتی ہے کاکلِ گفتار
کم پڑی ہوگی نوعِ انساں پر　　جس مصیبت سے آج میں ہوں دوچار

اُس طرف حسن خود سر و خود بیں　　اِس طرف عشق ضابط و خوددار
اُس طرف نازِ دلبری کا شکوہ　　اِس طرف شعرِ بیخودی کا وقار
اُس طرف حسن غرقِ صد نخوت　　اِس طرف عشق محوِ صد پندار
اُس طرف شوخیوں میں بھی تمکین　　اِس طرف اضطراب میں بھی قرار
اُس طرف بے رُخی ہے وصال سے　　اِس طرف ہے پرستشِ آزار
اُس طرف چارہ گر ہے بے پروا　　اِس طرف بے نیاز ہے بیمار
اُس طرف افتخارِ عشوہ و ناز　　اِس طرف اعتمادِ صبر و قرار
اُس طرف کیفِ نرگسِ مخمور　　اِس طرف دورِ بادۂ اشعار
اُس طرف عہد ہے نہ سُننے کا　　اِس طرف بند ہیں لبِ گفتار

کہنے جاؤں تو وہ سُنیں رودادُ ۔۔۔ سُننے آئیں تو میں کروں اظہار
مجھکو یہ کد، وُہ ہوں تبسم ریز ۔۔۔ اُن کو یہ ضد کہ یہ کرے اصرار

یہ روش ترک بھی اگر کر دوں ۔۔۔ ایک عُقدہ ہے اور بھی دُشوار
فرض کیجئے اُسے بھی سُلجھا دوں ۔۔۔ گُتھیاں اَور بھی تو ہیں دو چار
مُدّعا ہے غرض وُہ پیچیدہ ۔۔۔ کہ دُعا مانگنا بھی ہے دشوار

مجکو وصل و فراق، دونوں رسَن ۔۔۔ مجکو تریاق و زہر، دونوں دار
عہدِ اخلاص توڑنے میں بھی ننگ ۔۔۔ رشتہ شوق جوڑنے میں بھی عار
اُن کا آنا، بلائے ہوش و خرد ۔۔۔ اُن کا جانا وداعِ صبر و قرار
اُن سے ملئے تو عافیت برباد ۔۔۔ اُن سے کھنچئے تو زندگی بیکار
اُن کی وابستگی بھی سوزِ جحیم ۔۔۔ اُن کی بیگانگی بھی شعلہ ناز
اُن کا پردا بھی مُوجبِ ایذا ۔۔۔ اُن کا جلوہ بھی باعثِ آزار
اُن کی دُوری بھی خنجرِ خوں ریز ۔۔۔ اُن کی قُربت بھی دشنہ خونخوار
اُن کے کھونے پہ بھی نہیں راضی ۔۔۔ اُن کے پانے پہ بھی نہیں تیار
کون سمجھے گا اِن معمّوں کو ۔۔۔ عشق ہی مست عشق ہی ہشیار

عشق ہی ہجر کے لئے بیچین — عشق ہی وصل کے لئے بیمار
عشق ہی قدردانِ جلوۂ نور — عشق ہی مدح خوانِ گوشۂ تار
عشق ہی راہِ سعی میں خفتہ — عشق ہی بزمِ فکر میں بیدار
کس قدر ہیں عمیق یہ باتیں — کس قدر ہے عجیب یہ گفتار
کون سمجھے گا ان معمّوں کو — دُور ہیں آہ محرمِ اسرار

اس طرف تو یہ کشمکش دل میں — اور اُدھر ہے یہ رنگِ لیل و نہار
اک طرف زاہدوں کی مجلس میں — میری غیبت کا گرم ہے بازار
اِک طرف عاقلوں کی محفل سے — سُخنِ ناروا کی ہے بوچھار
قابلِ مضحکہ مرے انداز — درخورِ سرزنش مرے اطوار
گوش، پامالِ طعنۂ احباب — چشم، مجروحِ خندۂ اغیار
راہزن جمع، راہبر ناپید — رات تاریک، راہ ناہموار
آنکھ نمناک، راستے خس پوش — نور خوابیدہ، ظلمتیں بیدار
جلوے معدوم، مزے مفقود — چشمِ خونابہ ریز، گوش فگار
وضعِ اہلِ وطن معاذ اللہ — تہمتوں کے لگا دیئے انبار
غُربت افسردگی، وطن کلفت — غیر بے حس، عزیز ناہنجار

کس سے جا کر کہے کوئی احوال — کس سے جا کر کرے کوئی اظہار

اہلِ ظاہر، مجھے خس و خاشاک — اہلِ باطن، مجھے درو دیوار

بند ہے مجھ پہ فیضِ دیر و حرم — تنگ ہیں مجھ سے کافر و دیندار

سخت ہیں مجھ پہ کفر کے آئین — تیز ہے مجھ پہ شرع کی تلوار

اک طرف موت، ایک جانب زیست — وہ بہت سہل، یہ بہت دشوار

ہر سخن آگ، ہر نفس بجلی

"وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار"

سنہ ۱۹۲۴

نگارِ رفتہ

نگارِ رفتہ کو یارب! وطن میں پہنچا دے — دوبارہ دُرِّ عدن کو عدن میں پہنچا دے

حرم کی شمع کو طاقِ حرم میں روشن کر — چمن کی جان کو صحنِ چمن میں پہنچا دے

وطن کی روح کو جسمِ وطن میں واپس کر — غزالِ دشتِ ختن کو ختن میں پہنچا دے

سمن سے پھر سمنستان کو شادماں فرما — گہر کو پھر صدفِ پُرشکن میں پہنچا دے

صبا کو گل کدۂ آرزو میں رقصاں کر — صنم کو بتکدۂ برہمن میں پہنچا دے

وہ اپنے حسن سے مخجل ہیں اپنے عشق سے ہم — اس انجمن کو پھر اس انجمن میں پہنچا دے

سکوتِ جوش کو دے رخصتِ ترانۂ شکر — سخن کو حلقۂ شاہِ سخن میں پہنچا دے

سنہ ۱۹۲۴

شادی و مرگ

کدھر ہے اے موت؟ آ، کہ غم سے لبوں پر اب جان آ رہی ہے
وہ شمع، جو یادگارِ شب تھی، اُسے بھی آندھی بجھا رہی ہے

دہائی حسنِ خجستہ خو کی، کہ رسمِ عالم کی فتنہ خیزی
چھٹے ہوؤں کو ملا رہی ہے ملے ہوؤں کو چھڑا رہی ہے

اُدھر نفیری کی مست لہریں لیئے ہوئے ہیں پیامِ شادی
اِدھر نسیمِ سحر کی جنبش ترانۂ غم سُنا رہی ہے

اُدھر عروسی لباسِ زر میں دمک رہا ہے کسی کا مکھڑا
اِدھر کسی کی خوشی کو دُنیا سیاہ کفنی پنہا رہی ہے

قدیم پیغامبر بھی میری، صبا کو یہ آج کیا ہوا ہے؟
اِدھر بجھاتی چلی ہے شمعیں، اُدھر شگوفے کھلا رہی ہے

اِدھر کلیجے میں تھر تھراتا ہے شعلۂ مرگِ ناگہانی
اِدھر شبستانِ رنگ و بُو میں حیاتِ نو مسکرا رہی ہے

اِدھر عرق ہے مری جبین پر، اُدھر جھمکتی ہے جوشِ افشاں
اِدھر لبوں پر ہیں سرد آہیں، اُدھر صبا گنگنا رہی ہے

سنہ ۱۹۲۴ء

عشقِ کامراں

تعالیٰ اللہ کہ وہ دلدارِ شیریں
ہوا ہے پھر انیسِ جانِ غمگیں

مبارک اے دلِ حیراں مبارک
کہ پھر جاری ہوئے آئینِ پیشیں

ترانے چھیڑ اے بلبلِ طرب کے
کہ زیرِ سنگ ہے دامانِ گلچیں

خوشا طالع کہ میرے بازوؤں پر
مچلتی ہے وہ زلفِ عطر آگیں

حدیثِ لطف سے گرما رہے ہیں
مرے سینے کو وہ لبہائے رنگیں

بحمد اللہ وہ خود مائل ہوا ہے
برغمِ بندگانِ رسم و آئیں

محبت کامران و شادماں ہے
بھلا دو قصۂ فرہاد و شیریں

سنہ ۱۹۲۴

جفائے وفا

دل کی بستی میں کیوں نہ ہو کہرام
آہ یہ نامہ، ہائے یہ پیغام

کاش اسی وقت مجکو موت آ جائے
آگ میں پھول کس سے دیکھا جائے

کاش وہ یوں نہ باوفا ہوتی
بانیٔ ظلمِ ناروا ہوتی

اے وفا کیا کہوں ہیں تیرے طَور — تو ہے اِک بدترین آلۂ جور
تیرا نخچیر جی نہیں سکتا — ہِل کے پانی بھی پی نہیں سکتا
جھینپتی ہے جفا ترے آگے — کانپتی ہے قضا ترے آگے
بول اے نامہ بر جیوں کیسے؟ — پھر تو دُہرا، یہ کیا کہا اُس نے

"آنکھ کھُلتے ہی، صُبح تیری یاد
دل پہ کرتی ہے جانے کیا بیداد
دِل مرا غرقِ یاس رہتا ہے
شام تک جی اُداس رہتا ہے"

سنہ ۱۹۲۳

تیرے لئے

دیکھ کیونکر جی رہا ہوں دلربا تیرے لئے — ہر نفس ہے اک حدیثِ کربلا تیرے لئے
ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں اپنے کو تیری راہ میں — پوچھتا پھرتا ہوں میں اپنا پتا تیرے لئے
میں کہ آغوشِ سکوں میں پا چلا تھا آپ کو — پھر محیطِ کشمکش میں کھو گیا تیرے لئے
حسرتِ دل کی رواں ہیں کارواں در کارواں — ہر نفس ہے ہجر میں بانگِ درا تیرے لئے

آہ گو اک عمر سے ہوں میں رئیس ابن رئیس
بنکے نکلا ہوں گدائے بے نوا تیرے لئے

مانگتا ہوں بھیک دشمن سے تیرے قرب کی
شاہ کے کوچے میں دیتا ہوں صدا تیرے لئے

شرع سے درخواست کرتا ہوں کشودِ کار کی
کھٹکھٹاتا ہوں درِ دار القضا تیرے لئے

آہ اک فتویٰ کی خاطر کہنا پڑتا ہے مجھے
"شیخ" سے نااہل کو "مردِ خدا" تیرے لئے

جاہلانِ بے خرد کے ناسزا اقوال کو
ماننا پڑتا ہے بے چون و چرا تیرے لئے

چاک کر ڈالے میں نے آبائی امارت کا لباس
زیبِ تن کی ہے غلامی کی قبا تیرے لئے

مشتری جس کا خدا تھا چند سکوں کے عوض
بیچ دی میں نے وہ جنسِ بے بہا تیرے لئے

پھیر لیں آنکھیں مناظر سے ملیح آباد کے
لکھنؤ کی چھوڑ دی آب و ہوا تیرے لئے

کر چکا ہوں شدتِ حرماں سے تنگ آ کر معاف
ہر فرومایہ کو اپنا خوں بہا تیرے لئے

پوچھنا پڑتا ہے ہر کافر کو تیرے واسطے
ماننا پڑتا ہے ہر بت کو خدا تیرے لئے

آہ جو فرشِ حرم پر بھی کبھی جھکتا نہ تھا
میں نے بتخانے میں وہ سر رکھ دیا تیرے لئے

شرط پوری ہو چکی، للہ اب تو رحم کر
دیکھ کیا تھا جوشؔ، اور کیا ہو گیا تیرے لئے

۱۹۲۵ء

ناقابلِ تسخیر

ہمنشیں! ترکِ وفا پر اُسے توبیخ نہ کر — قید ہوتی ہے کہیں بوئے چمن، موجِ گہر؟
جلوۂ شبنم و نورِ سحر و رنگِ طیور — ان کی تسخیر کا دُنیا میں ہے کس کو مقدور؟

ہمنشیں! ترکِ وفا پر اُسے توبیخ نہ کر — وُہ بھی تھی بُوئے چمن، خندۂ گل، موجِ گہر

ہمنشیں! اُس کے لئے تنگ تھا پہلو میرا — کس لیے خاک میں ملتا نہ ہر آنسو میرا
پُوج اُس دل کو مرے جس نے اُسے رام کیا
اُس نے دو دن بھی جو چاہا تو بڑا کام کیا

۱۹۲۶ء

خواب کی پرچھائیں

سناٹا پچھلی رات کا ہے، مخلوقِ خدا کی خواب میں ہے
تاروں کی نگاہیں نیچی ہیں، ہلکی سی چمک مہتاب میں ہے

اطراف میں روشندانوں کے کچھ نور سا دھیما دھیما ہے
دیواروں کے نیچے گلیوں میں پر ہول اندھیرا چھایا ہے

پتوں کو سمیٹے خواب میں ہیں دبکی ہوئی بلبلیں کانوں پر
بول اٹھتا ہے بے ہنگام کبھی اک دھڑ پڑ دشتِ خواں پر

اللہ یہ کیسی بے چینی اس وقت دلِ بیتاب میں ہے؟
یہ عکس ہے کس کا فردوں پر کس کی یہ جھلک مہتاب میں ہے؟

فردوس کی شمعیں روشن ہیں، یا عکسِ چراغِ طور ہے یہ
گھر بھر میں یہ کس کا پرتو ہے ہر چیز پہ کیسا نور ہے یہ؟

حلقے میں گھرا ہوں جلووں کے ہستی کا نہیں کچھ ہوش مجھے
اس وقت یقیناً خواب میں کوئی دیکھ رہا ہے جوش مجھے

غربت میں ہے شانِ صبحِ وطن ہر چیز پہ وہ رعنائی ہے
پردیس میں اپنے مجنوں کی تسکین کو لیلیٰ آئی ہے

طوفان سا جوئے شیر میں ہے، حسن آیا ہے کشتی کھینے کو
بیتاب ہے شیریں بازو پر فرہاد کے بوسہ دینے کو

اک رنگ سا مجھ پر رقصاں ہے، اک نور سا دل پر چھایا ہے
ان ہونٹوں پہ شاید سوتے میں ہلکا سا تبسم آیا ہے

۱۹۲۵ء

جفائے التفات

کیا وہ بتلائے کیا کیا عشوۂ روزگار نے — مارا ہوس غریب کو حسنِ وفا شعار نے
اب وہ شہیدِ التفات دل کی گرہ کسے دکھائے — بند کیا درِ طرب جس پہ کشودِ کار نے
سمجھے گا کون نکتہ رس اسکی حدیثِ خونچکاں — جس کا لہو بہا دیا تیغِ وفائے یار نے
کون یقین لائے گا کس سے کہوں یہ ماجرا — لوٹ لیا مرا چمن عیشِ بہار نے
مصحفِ انبساط نے آیۂ حزن پیش کی — فتح سے دور کر دیا نصرتِ کردگار نے
مجکو درِ نشاط نے اشکِ الم عطا کیے — شامِ شکست نذر کی صبحِ ظفر شکار نے
حسن کے جذبِ عشق نے دل کو تباہ کر دیا — پھول کی روح کھینچ لی شبنمِ اشکبار نے

بھیس میں آ کے عشق کے جوش تجھے مٹاؤنگا
مجھ سے قسم یہ کھائی تھی حسنِ ستم شعار نے

سنہ ۱۹۲۲ء

آرزوئے محروم

فریاد ہے اے خلوتیِ پردۂ ناموس — کب سے ہوں تری دُھن میں گریبان دریدہ
واقف ہے کہ کس طرح سرِ بالش و بستر؟ — راتوں کو تڑپتا ہے ترا زلف گزیدہ

دم بھر کے لئے تو کبھی آغوش میں آ جا ۔۔۔ اے عمرِ رواں! سایۂ آہوئے رمیدہ!
ممکن ہو تو اب خاکِ مذلت سے اٹھا لے ۔۔۔ میں کب سے پڑا ہوں صفتِ اشکِ چکیدہ
وہ سجدہ کروں، سر ہی نہیں، روح بھی جھک جائے ۔۔۔ دے اذن اگر جنبشِ ابروئے خمیدہ
قسمت کی طرح دستِ طلب بھی تو ہے کوتاہ ۔۔۔ افسوس ہے اے میوۂ شاداب و رسیدہ!
وحشی کا کسی رت میں بھی جی خوش نہیں ہوتا ۔۔۔ فریاد ہے اے افسرِ گلہائے دمیدہ!
سونے کو ترستی ہیں برستی ہوئی آنکھیں ۔۔۔ بیدار ہوں اے ترکِ محبت نچشیدہ
ظالم! ترے دیوانۂ محروم کے سر پر ۔۔۔ ہر آن حریفوں کی کمانیں ہیں کشیدہ
آتا ہوں ترے شہر میں پامالِ ملامت ۔۔۔ جاتا ہوں تری راہ سے دشنام شنیدہ

"در کوئے تو معروفم و از روئے تو محروم
گرگِ دہن آلودہ و یوسف ندریدہ"
(سعدی)

سنہ ۱۹۲۶ء

کون لے گیا

اے یارِ دلنشیں! وہ ادا کون لے گیا ۔۔۔ تیرے نگیں سے نقشِ وفا کون لے گیا؟
حل کر دیا تھا جس نے معمہ شباب کا ۔۔۔ تجھ سے وہ فکرِ عقدہ کشا کون لے گیا؟
تھا لطف پہلے قہر میں، اب صرف قہر ہے ۔۔۔ ظلمت سے موجِ آبِ بقا کون لے گیا

کیوں دفعتہ لبوں پہ خموشی سی چھا گئی
اس سازِ دلنشیں کی صدا کون لے گیا؟

آنکھوں سے شانِ بذل و سخا کس نے چھین لی؟
سینے سے ذوقِ لطف و عطا کون لے گیا؟

تھیں جس کی رو سے خونِ تمنّا میں سُرخیاں
رُخسار سے وُہ رنگِ وفا کون لے گیا؟

راتوں کو مانگتا تھا دُعا میری دید کی
وُہ منّتیں، وُہ ذوقِ دُعا کون لے گیا؟

اے شاہِ بندہ پرور و سلطانِ نرم دل!
دل سے ترے خیالِ گدا کون لے گیا؟

پہلی سی وُہ کلام میں نرمی نہیں رہی
گفتار سے مزاجِ صبا کون لے گیا؟

اب جوشؔ کے لئے ہیں نہ آنسو، نہ آہِ سرد
اس گلستاں کی آب و ہوا کون لے گیا؟

سنہ ۱۹۲۶

آتے نہیں ہو تم

محرابِ جاں میں شمع جلاتے نہیں ہو تم
اب مسکرا کے سامنے آتے نہیں ہو تم

ظاہر میں تو حجاب ہو، در پردہ سامنا
پردا اب اُس ادا سے گراتے نہیں ہو تم

پہلے مری نظر تھی اور ارزانیٔ جمال
اب خواب میں بھی شکل دکھاتے نہیں ہو تم

جس کا ہر ایک حرف تھا اک دفترِ نشاط
وُہ بات اب زبان پہ لاتے نہیں ہو تم

آنکھوں میں اشک، رُخ پہ تمنّا، لبوں پہ آہ
اب اس ادا سے سامنے آتے نہیں ہو تم

میرے پیامبر کے اُٹھاتے تھے پہلے ناز — اب میرے دل کے ناز اُٹھاتے نہیں ہو تم
آتی ہیں حسبِ قاعدہ راتیں اسی طرح — لیکن نظر بچا کے اب آتے نہیں ہو تم
یک لخت تم نے جوشؔ کو دل سے بھلا دیا
اور اس میں بھید کیا ہے، بتاتے نہیں ہو تم

سنہ ۱۹۲۶ء

آن باقی ہے

ہنوز عشق و محبت کی شان باقی ہے — وُہی زمین، وُہی آسمان باقی ہے
جبیں پہ گو شکنِ عقل ہے زمانے سے — مگر نظر میں جنوں کا نشان باقی ہے
ربابِ فصلِ بہاری خموش ہے کب سے — ہنوز مطربِ وحشت کی تان باقی ہے
وہاں جفا ہی جفا رہ گئی ہے مدت سے — یہاں جفا پہ وفا کا گمان باقی ہے
جفا کا اب نہیں اگلا سا بانکپن قائم — مگر وفا کی وہی آن بان باقی ہے
وہ جوشؔ چھوڑ چکے ناوک افگنی پھر بھی
چمکتا تیر، لچکتی کمان باقی ہے

سنہ ۱۹۲۶ء

اُداس صُبح

خواب میں دیکھ کر رُخِ زیبا
آنکھ میری کھُلی تو کیا دیکھا

گھر ہے تاریک، تنگ، سرد، خموش
دل دھڑکتا ہوا، اُڑے ہوئے ہوش

تیغ سی فرش کی ہر ایک شکن
لب پہ خُشکی، دماغ میں اُلجھن

لے رہی ہے عجب طرح لہریں
ایک نرم سی آنچ کلیجے میں

ہِل گیا دل، کلیجہ یُوں دھڑکا
اسی ہلچل میں ہو گیا تڑکا

مُرغ بولے، فضا پہ جھلکا نور
صحنِ گلشن میں چہچہائے طیور

یُوں صدائیں ہواؤں پر کھیلیں
میں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں

سنہ ۱۹۲۶ء

خبر ہے کہ نہیں؟

اے صبا! کوچۂ جاناں میں گزر ہے کہ نہیں؟
تجھکو اُس فتنۂ عالم کی خبر ہے کہ نہیں؟

بجھ گیا مہر کا فانوس کہ روشن ہے ابھی؟
اب اُن آنکھوں میں لگاوٹ کا اثر ہے کہ نہیں؟

اب مرے نام کا پڑھتا ہے وظیفہ کوئی؟
اب مرا ذکرِ وفا وردِ سحر ہے کہ نہیں؟

اب بھی تکتی ہیں مری راہ وہ کافر آنکھیں؟
اب بھی وہ دیدہ نظر جانبِ در ہے کہ نہیں؟

چھپ کے راتوں کو مری یاد میں روتا ہے کوئی؟
موجزن آنکھ میں اب خونِ جگر ہے کہ نہیں؟

حسن کو پرسشِ بیمار کا ہے اب بھی خیال؟
مہر کی ذرّۂ خاکی پہ نظر ہے کہ نہیں؟

بے خبر مجھ کو زمانے سے کیا ہے جس نے
کچھ اُسے میری تباہی کی خبر ہے کہ نہیں؟

کھائے جاتا ہے مجھے دردِ غریب الوطنی
دل پر اُس جانِ وطن کے بھی اثر ہے کہ نہیں؟

جوشؔ خاموش بھی ہو پوچھ رہا ہے کیا کیا
کچھ تجھے تاڑنے والوں کی بھی خبر ہے کہ نہیں؟

سنہ ۱۹۲۶ء

تیرا عہدِ تمنّا

دل نے بخشا تھا تقاضائے زلیخا تجھکو
یاد ہے وہ خلشِ عہدِ تمنا تجھکو

چھنتے ہی تیرے دل سے جو دھواں اٹھتا تھا
شبِ تاریک تھا ہر نور کا تڑکا تجھکو

نرگسِ ناز میں یوں اشک بھرے رہتے تھے
نظر آتا تھا ورقِ مہر کا دھندلا تجھکو

الاماں عشق میں الجھی ہوئی تیری نظریں!
دل سا ملتا تھا ہر اک شے میں دھڑکتا تجھکو

روزِ باراں میں برستا تھا غمِ عشق مجھے
شبِ مہتاب میں ڈستی تھی تمنا تجھکو

ہر گھڑی میری حضوری کی تمنا تھی تجھے
ہر نفس میری جدائی کا تھا دھڑکا تجھکو

ہائے کیا دن تھے کہ آئینے کے آگے ہر صبح
چاند سا منہ نظر آتا تھا جب اترا تجھکو

حضرتِ خضر جہاں راہ بھٹک جاتے ہیں
عشق نے لا کے وہاں چھوڑ دیا تھا تجھکو

جب ہوا ابر کے سائے میں سنک جاتی تھی
چھیڑ دیتا تھا محبت کا تقاضا تجھکو

چاندنی صحن میں جس وقت چھٹک جاتی تھی
پھونک دیتا تھا مرے عشق کا شعلہ تجھکو

راستے سے کوئی آواز جب آ جاتی تھی
میری آواز کا ہو جاتا تھا دھوکا تجھکو

قہر ڈھاتا تھا مرا درسِ تحمل تجھ پہ
زہر لگتا تھا مرا وعدۂ فردا تجھکو

کیا قیامت تھی کہ اس گل بدنی کے باوصف
روز کانٹوں پہ لٹاتی تھی تمنا[3] تجھکو

میں کسی بات پہ دم بھر کے لئے غور کروں — اتنی فرصت بھی نہ ہوتی تھی گوارا تجکو

جوشؔ سے پوچھ کہ اب تک ہے اُسے یاد وہ دور

کہ کبھی مہر و وفا کا بھی تھا دعوےٰ تجکو

سنہ ۱۹۲۷

یہ بھی نہ سہی

تیرے قربان، اے خواب میں آنے والے — داستانِ عہدِ تمنّا کی سُنانے والے

ہاں ترے حرفِ شکایت سے پشیماں ہوں میں — بخش دے، بہرِ خدا، جُرم کہ انساں ہوں میں

یہ مگر وہم ہے اے پیکرِ حسنِ تنویر — کہ یہ دل اب ہے کسی اور کی زلفوں کا اسیر

ہاں ترے ہجر میں اک شغل نکالا ہے ضرور — شدّتِ کاہشِ آلام کو ٹالا ہے ضرور

قاعدہ ہے، نہیں ہوتا ہے فلک پر جب ماہ — لطف اُٹھاتی ہے چمکتے ہوئے تاروں سے نگاہ

بن ترے جب کسی کل چین نہیں پاتا ہوں — مَیں بھی یوں ہی دلِ افسردہ کو بہلاتا ہوں

تو ہے آزردہ، تو جھوٹی بھی تسلّی نہ سہی

رشک آتا ہے اگر تجکو تو یہ بھی نہ سہی

سنہ ۱۹۲۹ء

التجائے کرم

آ ناز سے پھر اور انیسِ دل و جاں ہو — اے خونِ طرب! عشق کی نبضوں میں رواں ہو

اللہ ری ظلمت کہ سجھائی نہیں دیتا — اے شمع! خدا کے لئے پھر شعلہ فشاں ہو

اے ماہِ شبِ چار دہم، پھول کھلا دے — اے موجِ نسیمِ سحری! عطر فشاں ہو

مرجھا کے نہ رہ جائے کہیں کشتِ تمنّا — اے ابرِ اجل! اے رُخِ خورشید! نہاں ہو

راتیں مجھے کانٹوں پہ بدلواتی ہیں پہلو — اے صُبح! علم کھول دے، اے نور عیاں ہو

اے صبح! کبھی رات کے پہلو میں بھی آجا — اے شاہ! گدا کا بھی کبھی مونسِ جاں ہو

اے بادہ! کبھی جامِ سفالیں میں بھی کر ناز — اے عرش! کبھی فرش پہ بھی نور فشاں ہو

اے دیدۂ مے پرور! اے نرگسِ مخمور! — دم بھر کے لئے میری طرف بھی نگراں ہو

اے غُنچہ لبی! حرف و حکایت کے کھلا پھول — اے گم سخنی! چشمۂ تقریر و بیاں ہو

اُکسا دے چراغ آ کے مرے خانۂ دل کا — قبل اس کے کہ شعلے کی جگہ صرف دُھواں ہو

تو ہاتھ جو آ جائے تو پھر جوش کے نزدیک
اک ہیچ کے برابر بھی نہ جنسِ دو جہاں ہو

۱۹۲۸ء

دو خواب

شب کہ واں سازِ طرب آسودۂ مضراب تھا
گوشۂ خلوت مرا اک دیدۂ پُر آب تھا

کُنجِ تنہائی میں تھا یاں صرف اک ناکام دل
مسندِ شادی پہ واں انبوہِ شیخ و شاب تھا

یاں اسیرِ یاس پہ چھائی ہوئی تھی مُردنی
واں عروسِ نو کا چہرہ غرقِ آب و تاب تھا

خاک پر، یاں سر تھا، اور آنکھوں میں اشکِ لالہ رنگ
فرش پر واں پھول تھے، اور چرخ پر مہتاب تھا

یاں بساطِ تشنگی پر تھیں بلا کی کروٹیں
واں حریمِ عیش میں دورِ شرابِ ناب تھا

تھی اُدھر تقدیر سے بادِ مُراد و موجِ نرم
اس طرف ٹوٹی ہوئی کشتی تھی اور سیلاب تھا

اُن کی چشمِ ناز میں تھا واں شکر خوابی کا رنگ
میری آنکھوں کو اِدھر فرمانِ ترکِ خواب تھا

آرہا تھا موج در موج اُس طرف ابرِ بہار
بحرِ غم میں اس طرف گرداب در گرداب تھا

نامرادی کا تصور بھی نہ تھا واں بار یاب
کامرانی کا تخیل بھی یہاں نایاب تھا

ناگہاں آلام کی شدت سے چکرانے لگا
سر کہ خلدِ زانوئے جاناں سے لذت یاب تھا

کس سے کہئے التفاتِ یار کی دریا دلی
ذرہ ذرہ بوستانِ شوق کا شاداب تھا

قصۂ رنگینِ عہدِ سجدہ ریزی کیا کہوں
سامنے اُن ابروؤں کا گوشۂ محراب تھا

عشق بازی کا غرورِ کامرانی، الاماں ۔۔۔ میری حسرت میں خود اُس کا حُسن جب بیتاب تھا

کاش ذوقِ نظربازی کی راتیں ہائے ہائے ۔۔۔ دیدۂ مخمور جب میرے لئے بیخواب تھا

لعلِ گوہر بیز کی ہر آہ تھی موجِ نسیم ۔۔۔ نرگسِ رنگیں کا ہر آنسو دُرِ خوش آب تھا

اور اب یہ بیدلی ہے انقلابِ دہر سے ۔۔۔ جیسے بحرِ لطف، ازل کے دن ہی سے پایاب تھا

تھا یہی عالم کہ آئی بامِ گردوں سے صدا
یہ بھی اک دن خواب ہو جائیگا، وہ بھی خواب تھا

سنہ ۱۹۲۹ء

التجائے مرگ[1]

کر قطع نخلِ عمر، گلستاں کا واسطہ ۔۔۔ یارب، بہارِ عالمِ امکاں کا واسطہ

اب نشۂ حیات سے دے ہوش کو فراغ ۔۔۔ تجکو خمارِ نرگسِ جاناں کا واسطہ

اب آفتابِ عمر کو دے رخصتِ غروب ۔۔۔ تجکو طلوعِ صبحِ بہاراں کا واسطہ

کام و دہن کو موت کی تلخی سے کر دو چار ۔۔۔ شکرفشانیٔ لبِ خوباں کا واسطہ

اب طولِ زندگی سے مجھے کر نہ شرمسار ۔۔۔ بالیدگیٔ زلفِ پریشاں کا واسطہ

ساقی پلا اجل کی اُبلتی ہوئی شراب ۔۔۔ عمرِ مسیح و چشمۂ حیواں کا واسطہ

---

[1] کسی کی نصیب دشمناں خطرناک ناسازیٔ مزاج کے موقع پر یہ نظم کہی گئی تھی۔

اب چشمِ تر سے چھین بھی لے نورِ زندگی — اہلِ نظر کے دیدۂ حیراں کا واسطہ
آنسو مری حیات کا ٹپکا دے خاک پر — یارب نزولِ قطرۂ نیساں کا واسطہ
دے روزِ تلخِ زیست کو اب حکمِ انقضا — تجھکو درازیِ شبِ ہجراں کا واسطہ

دہ قامتِ حیات پہ کر اب کمانِ مرگ
تجھکو سہی قدانِ گلستاں کا واسطہ

جھلکا مری جبیں پہ عرق کربِ نزع کا — رنگیں رخوں کی تابشِ افشاں کا واسطہ
اب مجھ زندگی سے فراغت کی دے نوید — شیریں لبوں کی سستیِ پیماں کا واسطہ
اب جلد چاک کر مرے رختِ حیات کو — چاکِ قمیصِ یوسفِ کنعاں کا واسطہ

چٹکی سے چھوڑ ناوکِ ہستی نشانہ کو
مست انکھڑیوں کی جنبشِ مژگاں کا واسطہ

سنہ ۱۹۲۹

گواہ رہنا

اے آم کے خوشنما درختو — اس بات کے تم گواہ رہنا
اس اجڑے ہوئے مکاں کے آگے — تھمتا نہیں آنسوؤں کا بہنا!

سنہ ۱۹۳۰

احسان نہ کیجئے

برباد مہر بزرگیٔ قرآں نہ کیجئے
اب زحمتِ اعادۂ پیماں نہ کیجئے

اب خانۂ اُمید میں ظُلمت ہی نُور ہے
تکلیفِ اہتمامِ چراغاں نہ کیجئے

دیکھے ہوئے ہوں کتنے بہار و خزاں کے رنگ
اب خارزارِ دل کو گلستاں نہ کیجئے

چھایا ہوا ہے مطلعِ اُمید پر غُبار
اب رُخ پہ کاکلوں کو پریشاں نہ کیجئے

انجامِ عذر خواہیٔ پیشیں کا واسطہ
اب اعترافِ جورِ فراواں نہ کیجئے

اب خطِ شوق بھیجئے بے رنگ ہی مجھے
افشاں کو صرفِ زینتِ عنواں نہ کیجئے

اب دل کو بزمِ ناز کی حسرت نہیں رہی
اب عُذرِ بدمزاجیٔ درباں نہ کیجئے

سلجھا چکا ہوں عقدۂ آسودگی موت
اب ذکرِ خضر و چشمۂ حیواں نہ کیجئے

اب خنجرِ فراق کو رکھئے نہ میان میں
اب توسنِ وصال کو جولاں نہ کیجئے

اقرارِ اولیں کا جنازہ ہے دوش پر
اب تازہ ہر رسمِ کہنۂ پیماں نہ کیجئے

جس دل پہ ناز تھا وہی باقی نہیں رہا
اب زندگی سے مجھ کو پشیماں نہ کیجئے

دم ہی نہیں ہے جوشش میں تجدیدِ شوق کا
احسان اب یہی ہے کہ احساں نہ کیجئے

سنہ ۱۹۲۹

گھٹا چھائی تو کیا؟

چھٹ گئے جب آپ ہی اودی گھٹا چھائی تو کیا؟ — تربتِ پامال کے سبزے پہ لہر آئی تو کیا؟

جب ضرورت ہی رہی باقی نہ لحن و رنگ کی — کوئلیں کوکیں تو کیا، ساون کی رُت آئی تو کیا؟

ہجر کے آلام سے جب چھٹ چکی نبضِ نشاط — اب ہوا نے خار و خس میں رُوح دوڑائی تو کیا؟

ہو چکی ذوقِ تبسم ہی سے جب بیگانگی — اب چمن افروز پھولوں کو ہنسی آئی تو کیا؟

مُڑ چکی جب تُربت کے جادے کی جانب زندگی — اب کسی نے عافیت کی راہ دکھلائی تو کیا؟

ہر نفس کے ساتھ دل سے جب دھوئیں اُٹھنے لگا — بادلوں سے چھن کے اب ٹھنڈی ہوا آئی تو کیا؟

سامنے جب آپ کے گیسو کی لہریں ہی نہیں — بدلیوں نے چرخ پر اب زلف بکھرائی تو کیا؟

ہو چکا پایاب جب بحرِ سرود و برگِ شباب — اب سمندر کی جوانی باڑھ پر آئی تو کیا؟

غنچۂ عہدِ طرب ہی مل چکا اب خاک میں — خاکِ گلشن اب گلِ تر بن کے اترائی تو کیا؟

مٹ چکے جب والہانہ بانکپن کے ولولے — آئی اب دوشیزۂ موسم کو انگڑائی تو کیا؟

کھل چکا جب پرچمِ غم زندگی کے قصر پہ — اب ہواؤں نے کمر پودوں کی لچکائی تو کیا؟

آنسوؤں میں بہ گئیں جب خون کی جولانیاں — جنگلوں کی چھاؤں میں برسات اٹھلائی تو کیا؟

جوشؔ کے پہلو میں جب تم ہی مچل سکتے نہیں
پھر گھٹا کے دامنوں میں برق لہرائی تو کیا؟

۱۹۳۵ء

اب کیا کروں؟

چھا گئی برسات کی پہلی گھٹا اب کیا کروں؟
خوف تھا جس کا وہ آ پہنچی بلا، اب کیا کروں؟

ہجر کو بہلا چلی تھی گرم موسم کی سموم
ناگہاں چلنے لگی ٹھنڈی ہوا، اب کیا کروں؟

آنکھ اُٹھی ہی تھی کہ ابرِ لالہ گوں کی چھاؤں میں
درد سے کہنے لگا کچھ جھٹپٹا، اب کیا کروں؟

اشک ابھی تھمنے نہ پائے تھے کہ بیدردی کیساتھ
بوندیوں سے بوستاں بجنے لگا، اب کیا کروں؟

زخم ابھی بھرنے نہ پائے تھے کہ بادل چرخ پہ
آ گیا انگڑائیاں لیتا ہوا، اب کیا کروں؟

آ چکی تھی نیند سی غم کو کہ موسم ناگہاں

بحر و بر میں کروٹیں لینے لگا، اب کیا کروں؟

چرخ کی بے رنگیوں سے سست تھی رفتارِ غم

یک بیک ہر ذرّہ گلشن بن گیا، اب کیا کروں؟

قفلِ بابِ شوق تھیں ماحول کی خاموشیاں

دفعتًہ کافر پپیہا بول اُٹھا، اب کیا کروں؟

ہجر کا سینے میں کچھ کم ہو چلا تھا پیچ و تاب

بال بکھرانے لگی کالی گھٹا، اب کیا کروں؟

ہٹ کو چھپانے لگی تھی دل میں یادِ لحنِ یاد

مور کی آنے لگی بن سے صدا، اب کیا کروں؟

گھٹ چلا تھا غم کی رنگیں بدلیوں کی آڑ سے

اُن کا چہرہ سامنے آنے لگا، اب کیا کروں؟

آ رہی ہیں ابر سے اُن کی صدائیں "جوش جوش"

اے خدا اب کیا کروں، بارِ خدا اب کیا کروں؟

۱۹۳۵ء

طوفان کی آرزو

پھر دل کو ہے جراحتِ پنہاں کی آرزو
یعنی کسی کی جنبشِ مژگاں کی آرزو

پھر چبھ رہے ہیں قلب میں غربت کے خار و خس
پھر ہے وطن کے سنبل و ریحاں کی آرزو

پھر ہے جمودِ شامِ بلا، وحشت آفریں
پھر ہے طلوعِ صبحِ درخشاں کی آرزو

پھر روح، شورِ زاغ و زغن سے ہے بیقرار
پھر دل کو ہے خروشِ ہزاراں کی آرزو

پھر ہے ہوائے شہرِ ملامت کا اشتیاق
پھر ہے سوادِ کوچۂ جاناں کی آرزو

پھر قیدِ عقل و ہوش سے گھبرا چکا ہے دل
پھر ہے جنونِ سلسلہ جنباں کی آرزو

پھر ہے طلسمِ عشوۂ ترکانہ کی تلاش
پھر ہے فریبِ وعدۂ جاناں کی آرزو

پھر نبضِ شوق میں ہے تپاں خونِ اضطراب
پھر جوئے سست رو کو ہے طوفاں کی آرزو

پھر قلب میں ہیں پہلوئے جاناں کی حسرتیں
پھر دوش پر ہے زلفِ پریشاں کی آرزو

پھر لے رہی ہے شدتِ وحشت کروٹیں
پائے طلب میں کوہ و بیاباں کی آرزو

پھر بخیہ ہائے چاکِ جگر کو ہے آج کل
اک شوخ کے تبسمِ پنہاں کی آرزو

پھر شعلہ زن ہے قصرِ تغافل گزیدہ میں — ماضی کے التفاتِ فراواں کی آرزو
پھر سقف و بام گوشۂ خلوت پہ ہے محیط — بزمِ نشاط و سیرِ گلستاں کی آرزو
پھر مسندِ خیال پہ ہے گرمِ رستخیز — شمع و شراب و شعر و شبستاں کی آرزو
پھر جلوہ گر ہے منظرِ وہم و خیال پر — اک نو بہارِ فتنۂ دوراں کی آرزو
بیزار ہے سکون کی راتوں سے جانِ زار — آنکھوں کو پھر ہے خوابِ پریشاں کی آرزو
بے گریہ خال و خط پہ ہے رنگِ فسردگی — رُخ پر ہے آنسوؤں سے چراغاں کی آرزو

پھر کچھ دنوں سے دیدۂ گریاں جوش میں
غلطاں ہے اُن کے گوشۂ داماں کی آرزو

سنہ ۱۹۳۰ء

پھر اُس طرف چلا ہوں

پھر اُس طرف چلا ہوں فسانہ لئے ہوئے
ماضی کا ہر نفس میں ترانہ لئے ہوئے

پھر جا رہا ہوں جانبِ معمورۂ طرب
ویران دل میں غم کا خزانہ لئے ہوئے

پھر خود سے مکر کرکے رواں ہوں سوئے نگار
سیر و سفر کا دل میں بہانہ لئے ہوئے

پھر کوئے سرخوشی کی طرف بڑھ رہا ہوں میں
شعر و شراب و چنگ و چغانہ لئے ہوئے

پھر جا رہا ہوں ذہنِ حسرت آرمیدہ میں
بھولا ہوا جنوں کا زمانہ لئے ہوئے

پھر بزمِ رنگ و بو کی طرف مڑ رہا ہے دل
خوں گشتہ زندگی کا فسانہ لئے ہوئے

پھر گامزن ہوں میکدۂ دوش کی طرف
رفتار میں خمارِ شبانہ لئے ہوئے

کیا نازِ عشق ہے کہ اُدھر جا رہا ہوں جوشؔ
اس فقر پر بھی طبعِ شہانہ لئے ہوئے

سنہ ۱۹۳۰

دریوزۂ بے مہری

ماضی کی سمت ہنس کے اشارا نہ کیجئے ‏ اب ذکرِ آب و رنگِ تمنّا نہ کیجئے
مانوس ہو چکا ہوں غمِ روزگار سے ‏ اب ساز و برگِ عیش مہیّا نہ کیجئے
سینہ مآلِ ذوقِ طرب سے ہے چاک چاک ‏ اب فتنۂ نشاط کا در وا نہ کیجئے
سرمستیِ شبانہ کا انجام، الاماں ‏ اب اہتمامِ ساغر و مینا نہ کیجئے
دل کو لبھا چکی ہیں تغافل شعاریاں ‏ تکلیفِ التفات گوارا نہ کیجئے
راس آ چکی ہے عشق کو بے چین زندگی ‏ اب میرے اضطراب کی پروا نہ کیجئے
دل صلح کر چکا ہے زمانے کے بخل سے ‏ اب مرحمت کی زحمتِ بیجا نہ کیجئے
تھے جس میں وہ شرار کہ اللہ کی پناہ! ‏ اب پھر اسی امید کو پیدا نہ کیجئے
اُف ری مزاجِ حسن کی باطل نوازیاں ‏ اب عشقِ حق پسند کا پرچا نہ کیجئے
کیا فائدہ کہ جاگ اُٹھے پھر سے آرزو ‏ اب ذکرِ بے وفائیِ دنیا نہ کیجئے
ہر آن گوشِ رس میں چبھتی تھی جسکی دھار ‏ وہ لوچ پھر زبان میں پیدا نہ کیجئے
زخمی تھیں جسکی باڑھ سے بے خواب کروٹیں ‏ وہ تیغ اب نظر میں ہویدا نہ کیجئے

اِک عُمر اعتدال سی بھی لے چکا ہوں کام — اب شکوۂ مزاجِ تمنّا نہ کیجئے
دِل پر گذر چکی ہیں ہزاروں قیامتیں — اب مسکرا کے وعدۂ فردا نہ کیجئے
سینے میں بے نقاب ہیں سابق کے تجربے — اب پرسشِ خلوص کا دعویٰ نہ کیجئے
تجدیدِ چاک کی نہیں دامن کو آرزو — اب نقلِ اضطرابِ زلیخا نہ کیجئے

لیکن اگر حضور کو بدبخت جوشؔ پر
آتا نہیں ہے رحم، تو اچھا نہ کیجئے

سنہ ۱۹۲۰

انتہائی بے تعلقی

روبرو اس کے گیا میں اس قدر مدت کے بعد
اس کا کیا غم اُس نے اُلٹے سی عنایت بھی نہ کی
مجکو تو صرف اس کا شکوہ ہے کہ اُس نے مجھسے جوشؔ
اِتنے دن تک دُور رہنے کی شکایت بھی نہ کی

سنہ ۱۹۳۰

دریوزۂ نظر

خدا کے واسطے اے حاجبو نہ دیر کرو
حریمِ ناز میں کوئی پکار کر کہہ دو

کہ پھر کوئی وطن آوارہ و جگر افگار
ملول و بےکس و مجبور و غم کش و بیمار

جگر کو خون کیے سختیاں اٹھائے ہوئے
درِ حضور پہ حاضر ہے سر جھکائے ہوئے

دھڑک رہا ہے کلیجہ ہر ایک آنسو میں
پکارتا ہے کہ دل اب نہیں ہے قابو میں

مرا رفیق نہیں ہے کوئی خدائی میں
زمیں جگہ نہیں دیتی تری جدائی میں

جبیں کے نقش میں رنگِ سجود بھرنے کو
ہوا ہوں دور سے حاضر سلام کرنے کو

نہ مرحمت نہ محبت کا خواستگار ہوں میں
بس ایک نیم نظر کا امیدوار ہوں میں

سنہ ۱۹۳۰ء

نقشِ خیال دل سے مٹایا نہیں ہنوز

نقشِ خیال دل سے مٹایا نہیں ہنوز
بیدرد میں نے تجھکو بھلایا نہیں ہنوز

تیری ہی زلفِ ناز کا اب تک اسیر ہوں
یعنی کسی کے دام میں آیا نہیں ہنوز

یادش بخیر جس پہ کبھی تھی تری نظر
وہ دل کسی سے میں نے لگایا نہیں ہنوز

وہ سر جو تیری راہ گزر میں تھا سجدہ ریز
میں نے کسی قدم پہ جھکایا نہیں ہنوز

محرابِ جاں میں تو نے جلایا تھا خود جسے
سینے کا وہ چراغ بجھایا نہیں ہنوز

اُس پیکِ خاص کو جسے ٹھکرا چکا ہے تو
اپنی نظر سے میں نے گرایا نہیں ہنوز

بے ہوش ہو کے جلد تجھے ہوش آگیا
میں بد نصیب ہوش میں آیا نہیں ہنوز

دُنیا نے تجھکو خوابِ گراں سے جگا دیا
لیکن مجھے کسی نے جگایا نہیں ہنوز

تو کاروبارِ شوق میں تنہا نہیں رہا
میرا کسی نے ہاتھ بٹایا نہیں ہنوز

گردن کو آج بھی تری بانہوں کی یاد ہے
یہ منتوں کا طوق بڑھایا نہیں ہنوز

مر کر بھی آئے گی یہ صدا قبرِ جوش سے
بیدرد میں نے تجھکو بھلایا نہیں ہنوز

سنہ ۱۹۳۰ء

ہنوز یاد ہے

ہنوز یاد ہے وُہ رنگِ اضطراب ترا
بھرا اُٹھا درد کے نغموں سے جب رباب ترا
عجیب دَور تھا وُہ دَور بھی جبِ او ظالم
لباسِ عشق میں تھا حسنِ لاجواب ترا
جو شب کو رُوپ میں پروانے کے تھی شمع تری
سحر کو بھیس میں بلبل کے تھا گلاب ترا
وُہ تیری پہلی ملاقات کی وُہ پہلی رات
اُدھر تھا چاند، اِدھر دیدۂ "پُرآب" تھا
کبھی خدا کی مشیّت پہ برہمی تیری
کبھی خود اپنی تمنّاؤں پر عتاب ترا
وُہ ماہتاب کے طوفاں میں اُلجھنیں تیری
وُہ ابر و باد کی ہلچل میں اضطراب ترا
وُہ ابتدائے محبت کی تُند راتوں میں
بساطِ جسم پہ مچلتا ہوا شباب ترا

وُہ آنسوؤں کے دھندلکے میں چشمِ ناز تری
وُہ کروٹوں کے تلاطم میں فرشِ خواب ترا
وُہ بات بات میں چھالے کا سا تپک اُٹھنا
نظر جھکا کے وُہ لہجہ دمِ خطاب ترا
وُہ میری بزمِ محبّت، وُہ تیری شمعِ جمال
وُہ دامِ ذرّۂ خاکی میں آفتاب ترا
وُہ تیری زلف کے خم سے مری پریشانی
وُہ اپنی سانس کی خوشبو سے پیچ و تاب ترا
وُہ اضطراب کا روندا ہُوا سکون مرا
وُہ ولولوں کا ستایا ہُوا حجاب ترا
مژہ کی طرح جھپکتا ہُوا وُہ میرا سوال
وُہ دل کی طرح دھڑکتا ہُوا جواب ترا
یہ پُوچھ جوشؔ سے کس درجہ تلخ و شیریں ہے
اُس التفات کے بعد اب یہ اجتناب ترا

سنہ ۱۹۳۱ء

یاد کرو وہ دِن

یاد کرو وہ دِن کہ ہم تھے رازدانِ یک دگر
رازدانِ یک دگر، شرح و بیانِ یک دگر

یاد کرو وہ دن کہ ہم تھے دورِ نوشانوش میں
لحنِ شیریں و شرابِ ارغوانِ یک دگر

یاد کرو وہ دِن کہ ہم تھے قربِ کامل کے طفیل
قالبِ یک دیگر و رُوحِ روانِ یک دگر

یاد کرو وہ دن کہ ہم تھے بزمِ فکر و بحث میں
ہم خیال و ہم نوا و ہم زبانِ یک دگر

یاد کرو وہ دِن کہ ہم تھے عہدِ صلح و جنگ میں
مہربانِ یک دگر، نامہربانِ یک دگر

یاد کرو وہ دن کہ ہم تھے شام سے تا صبح گاہ
قصۂ یک دیگر و افسانہ خوانِ یک دگر

یاد کرو وہ دن کہ ہم تھے کاروبارِ شوق میں
دولتِ یک دیگر و جنسِ دکانِ یک دگر

یاد کرو وہ دن کہ ہم تھے آرزو کی راہ میں
کاروانِ شوق و گردِ کاروانِ یک دگر

یاد کرو وہ دِن، بہ رنگِ جوشِ حبِّ ناز و نیاز
دورِ سوز و ساز میں تھے ترجمانِ یک دگر

سنہ ۱۹۳۲ء

کتبہ: محمد شریف عباسی خوش نویس لاہور